
تعلیم و تربیت

اکتوبر 1974

چونتیس 34 واں سال

ساتواں شمارہ

ایک رسالہ : 1.50

سالانہ 15.00

ماہنامہ

لاہور

تعلیم و تربیت

نگرانِ اعلیٰ:

عبدالحمید خاں

اڈیٹر:

سعید لخت



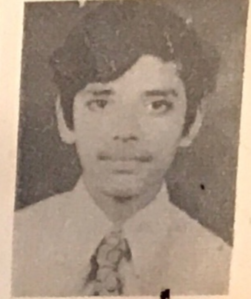
مطبوعہ

فیروز سنز لمیٹڈ لاہور

باہتمام

عبدالحمید خاں پرنٹر و پبلشر





شفقت علی کراچی



سہیل انجم اسلام آباد



مشتاق احمد مظفر آباد



خان ناصر عالم لائلپور



عدنان عزیز لاہور



محمد سعید میرپور خاص



محمد امین کراچی



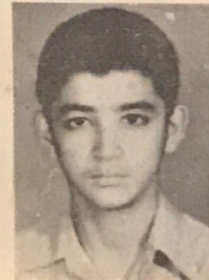
عارف علی گھڑیال کلاں



عارف سبحانی



ظفر حسین بیگ



رشید بٹ جہلم



محمد منظور علوی جہلم



شاہ زمان واہ کینٹ



رفیق احمد دائرہ دین پناہ



راجہ پرویز اختر



شفقت حیات ملتان

عِید آئی



غُنچے چٹک رہے ہیں، اس عید کی خوشی میں
پُھولوں کی انجمن ہے مصرُوف دِل لگی میں
پیڑوں کی ٹہنیوں پر چڑیاں چہک رہی ہیں
باغوں میں پیاری پیاری کلیاں مہک رہی ہیں
پُھولوں کے دِل کِھلے ہیں، بُلبل کے چہچہوں سے
اور سرو ہنس رہے ہیں، قمری کے قہقہوں سے
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے گانا سا گا رہے ہیں
نغمے مسرّتوں کے کانوں میں آ رہے ہیں
ہے عید کی مسرّت سارے جہاں پہ طاری
خوشیاں منا رہی ہے خلقت خُدا کی ساری
بچّوں کا پُوچھنا کیا، چہرے کِھلے ہُوئے ہیں
کھانے پہ شِیر خُرما سارے پلے ہُوئے ہیں
اچھّے لباس پہنے سب نے نہا نہا کر
ماں باپ نے نظر کی بچّوں پہ مُسکرا کر
سج بن کے گھر سے نکلے، خوش خوش ہوئے روانہ
پڑھنے کو عید گہہ میں سب عید کا دوگانہ
آپس کے سارے جھگڑے اب بُھول جائیں گے یہ
اُلفت کے پاک نغمے سب مِل کے گائیں گے یہ

(اشرف صبُوحی)



اِشتیاق احمد

بِلّیوں کی حکُومت

یہ کسی جزیرے کی کہانی نہیں، جس پر بلّیوں نے قبضہ کر لیا ہو۔ نہ کسی ایسے جادُوئی دیس کی کہانی ہے جہاں کسی جادُوگر نے جادو کے زور سے انسانوں کو بلّیاں بنا دیا ہو۔ یہ تو سِرے سے کوئی کہانی ہے ہی نہیں۔

جی ہاں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ اُن دِنوں ہمارے گھر پر بلّیوں کی حکومت تھی اور بلّیوں کی یہ حکومت میری وجہ سے قائم ہوئی تھی۔ میں نے سارے گھر کی مخالفت کے باوجُود گھر میں ایک عدد بلّی پال لی تھی۔ بھائی جان بلّی پالنے کے سخت مُخالف تھے۔ باجی بلّی کے سائے سے بھڑکتی تھیں، اور امّی جان اور ابّا جان تو بلّی کی صورت ہی سے بیزار تھے۔ ان حالات میں میرا ایک عدد بلّی پال لینا ایک بڑے کارنامے سے کم نہیں تھا۔ سب کی مخالفت مول لی، ہاتھ جوڑے، منّتیں کیں اور جب کچھ نہ بنا تو بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ میں ٹھہرا سب سے چھوٹا اور سب کا لاڈلا۔ میری بھوک بھلا کس سے برداشت ہو سکتی تھی اور پھر اس ہتھیار کے آگے تو اچھے اچھے بھی گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔ لہٰذا سب کو ہار ماننا پڑی۔

ہار مانتے وقت ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن اس گھر میں ہر طرف بلّیاں

ہی بلّیاں ہوں گی۔ ہُوا یہ کہ میری بلّی نے، جسے میں نے کِٹّی کا نام دیا تھا، پڑوس کی تین چار بلّیوں سے دوستی کرلی۔ برسات کا موسم آیا تو ان سب نے ایک ساتھ بچّے دے ڈالے۔ بس پھر کیا تھا۔ جونہی بچّے ذرا بڑے ہُوئے گھر میں جیسے بھونچال آنے لگا۔ میری بلّی کے بچّوں نے تو خیر گھر میں ڈیرا ڈالا ہی تھا، اس کی سہیلیوں کے بچّے بھی اسی گھر کو پسند کرنے لگے اور دن رات یہیں رہنے لگے۔ ایک دن میں نے ان سب کو بڑی مشکل سے گِنا۔ پُورے اُنیس ۱۹ تھے۔

آیئے، اب میں آپ کو بتاؤں کہ ان دنوں ہمارے گھر میں کیا ہو رہا تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ سب اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہُوئے تھے۔ اچانک بھائی جان نے مجھے آواز دی:

"ارے بھئی شوکی ....!"

"میاؤں!" بستر سے جواب ملا۔

"ہائیں! یہ بستر پر تم سو رہے ہو یا بلّیاں؟" بھائی جان غُصّے کے عالم میں میرے بستر کی طرف بڑھے اور پھر بستر کی چادر ایک جھٹکے سے اُلٹ دی۔ دُوسرے ہی لمحے اُن کے مُنھ سے ایک چیخ نِکلی۔ میرے بستر سے بلّی کے بچّے اُٹھ اُٹھ کر گھر کے مختلف کونوں کا رُخ کر رہے تھے۔

"حد ہو گئی! تمھیں کتنی مرتبہ منع کیا ہے کہ ان کم بختوں کو بستر پہ نہ سُلایا کرو۔"

"میں کب سُلاتا ہوں۔ یہ تو خود ہی چڑھ آتے ہیں۔"

"بھگا دیا کرو۔"

"پھر آجاتے ہیں۔" میں نے معصُومیّت سے کہا۔

جونہی بھائی جان وہاں سے ہٹے، ایک بار پھر میاؤں کی آواز آئی۔ ساتھ ہی بھائی جان کی چیخ نکل گئی۔ بلّی کے ایک ننھے بچّے کی دُم پر ان کا پاؤں پڑ گیا تھا۔ عین اُسی وقت باجی کی چیخ سُنائی دی:

"شوکی، فوراً اِدھر آؤ۔" میں ان کی طرف دوڑا۔ وہ غُسل خانے کے دروازے پر کھڑی تھیں:

"کیا ہُوا باجی؟" میں نے گھبرا کر پُوچھا۔

"تمھارا سر۔ نکالو ان بدبختوں کو غُسل خانے سے۔" انھوں نے آنکھیں نکالیں۔



"ارے! یہ یہاں بھی پہنچ گئے۔" میں نے حیران ہو کر کہا اور غُسل خانے میں گھس گیا۔ چار پانچ بچّے پانی کے ٹب میں چھینٹے اُڑا رہے تھے اور ایک صاحب نل کے اُوپر چڑھے ہوتے تھے۔ غسل خانے سے انھیں نِکال کر فارغ ہوا ہی تھا کہ باورچی خانے سے امّی جان کی غضب ناک آواز آئی "شوکی، خُدا تمھیں غارت کرے۔ اِدھر آؤ۔"

"میں ہانپتا کانپتا اُدھر دوڑا۔" کیا بات ہے امّی؟"

"بات پوچھتے ہو۔ تمھارے لاڈلوں نے سارے باورچی خانے کو کباڑ خانہ بنا دیا ہے۔ ذرا دیکھو تو، کیسے دھرنا مارے بیٹھے ہیں۔"

میں اندر داخل ہوا۔ دو بچّے برتنوں کی الماری میں گھُسے دھما چوکڑی مچا رہے تھے۔ ایک آٹے کے تھیلے پہ بیٹھا اپنی ناک رگڑ رہا تھا۔ ایک صاحب انڈے توڑ توڑ کر پیلے میں

ڈال رہے تھے۔ دُوسرے صاحب نے فرائنگ پین سنبھال رکھا تھا۔ شاید آملیٹ بنانا چاہتے تھے۔

میں انھیں اُٹھا اُٹھا کر باہر پھینکنے لگا۔ اچانک ابا جان کی آواز کانوں سے ٹکرائی:

"شوکی، کہاں ہو تم؟"

میں ابا جان کے کمرے کی طرف دوڑا۔ وہ دیکھتے ہی چلّائے:

"او مردُود، یہ کیا آفت مچا رکھی ہے تم نے؟"

"جی؟ میں نے؟" میں نے حیران ہو کر پُوچھا۔

"اور نہیں تو کیا میں نے؟ یہ بلّی کے بچّے تم نے ہی تو پالے ہیں۔"

"جی.... میں نے صرف ایک بلّی پالی تھی۔" میں نے گھبرا کر جواب دیا۔

"بکو مت۔ چلو، ان کو باہر نکالو۔"

"یہاں بھی پہنچ گئے یہ" میں نے حیران ہو کر کہا کیوں کہ ابا جان اپنے کمرے کے دروازوں کو ہر وقت بند رکھتے تھے

"ہاں۔ رات ایک کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔"

میں نے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ ابا جان کی میز پر تین بچّے قابض تھے۔ میز کے تمام کاغذات زمین پر بکھرے پڑے تھے اور دو بچّے اخبار کی، شاید، کشتی بنا رہے تھے۔ ابھی انھیں بھگا کر فارغ ہُوا ہی تھا کہ امّی جان نے آواز دی:

"شوکی، اگر تم فارغ ہو گئے ہو تو باورچی خانے میں آکر میرا ہاتھ بٹاؤ۔"

"کیوں؟ باجی کہاں گئیں؟" میں نے باہر سے ہی پوچھا کیوں کہ بلّی کے بچّوں کے پیچھے بھاگ بھاگ کر تھک چکا تھا۔

"وہ نہا رہی ہے۔"

"فرمائیے؟ کیا کرنا ہے؟" میں نے باورچی خانے میں پہنچ کر پوچھا۔

"پہلے تو وہ دودھ والی دیگچی مجھے پکڑا دو۔"

میں نے دیگچی اُٹھائی۔ وہ خالی تھی۔ "یہ تو خالی ہے۔ دُودھ کسی اور میں ہوگا۔" میں نے کہا۔



"خالی ہے؟ لیکن دُودھ تو میں نے رات اسی میں گرم کیا تھا۔"

میں نے دیگچی کا ڈھکنا اُٹھا کر دیکھا۔ دیگچی اندر سے بالکل صاف تھی۔

"یہ تو بالکل صاف ہے ــــ بالکل دُھلی دُھلائی۔"

"حیرت ہے!" امّی جان کے منہ سے نکلا۔

انھوں نے تمام دیگچیاں دیکھ ڈالیں۔ دودھ کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ آخر پتا چلا کہ دودھ اسی دیگچی میں تھا اور بلّیوں کے بچّوں نے رات دعوت اڑائی تھی لیکن حیرت اس بات پر تھی کہ انھوں نے دیگچی میں کہیں بھی دودھ لگا نہ رہنے دیا۔ بالکل دھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کے بعد امّی نے مجھے جن نگاہوں سے گُھورا، بیان سے باہر ہے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر جو وہاں سے بھاگا تو اپنے کمرے میں پہنچ کر ہی دم لیا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ کرسی پہ گر گیا۔ دوسرے ہی لمحے ایک دردبھری آواز نیچے سے اُبھری۔

"میاؤں!" میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

ایک بچّہ مجھ سے پہلے ہی کرسی پر بیٹھا تھا اور میں اسی کے اُوپر بیٹھ گیا تھا۔ خُدا کا شکر ہے کہ پوری طرح نہیں بیٹھ پایا تھا کہ اچھل پڑا۔ بلّی کا بچّہ اُٹھ کر بھاگا اور کمرے کے ایک کونے میں دبک کر مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں

نہ جانے کیا تھا کہ مجھے ترس آگیا۔ آگے بڑھ کر پچکارتے ہوئے اس کو اُٹھا لیا اور اپنی میز پر بیٹھ گیا۔

اب میں میز پر بیٹھا یہ مضمون لکھ رہا ہوں اور بلّی کا بچّہ مجھے لکھتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ میں اسی کے بہن بھائیوں کے متعلّق لکھ رہا ہوں۔ ان کی وجہ سے ہر روز میری مرمّت ہوتی ہے اور یہ ہیں کہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے۔ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ان کے کانوں پر جُوں تک نہیں رینگتی۔

اب... اس وقت جب کہ میں یہ مضمون لکھ رہا ہوں.... یہ بچّہ اپنا کام کر ہی گیا میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ مضمون یہیں پر ختم کرنا ہو گا۔ کیوں کہ اچانک بلّی کے بچّے نے میرے دائیں ہاتھ کی اُنگلی پر جھپٹّا مارا، اور انگلی مُنہ میں لے کر چبا ڈالی اب مجھے یاد آیا کہ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے ہاتھ نہیں دھوئے تھے۔ ہاتھ سے ناشتے کی خوش بُو آ رہی تھی۔ اس لیے بچّہ اُسے بھی ناشتے کی کوئی چیز سمجھ بیٹھا.... اور اب جب کہ میری اُنگلی زخمی ہو گئی ہے، میں مزید کچھ لکھنے سے قاصر ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور پُوری تفصیل سے واقعات لکھتا تو شاید پورا ایک ناول لکھ ڈالتا۔ بہر حال، یہ آخری الفاظ کسی نہ کسی طرح بائیں ہاتھ سے لکھ رہا ہُوں تاکہ مضمون تعلیم و تربیت میں چھپ سکے۔ دُعا کیجیے، میری انگلی جلد ٹھیک ہو جائے اور میں پھر بلّیوں کی حکومت پر کچھ لکھ سکوں۔

پیارے بچّو! پچھلے مہینے ہم نے، کاغذ کی مہنگائی اور دوسرے اخراجات میں بے پناہ اضافے کی وجہ سے، تعلیم و تربیت کی قیمت ایک رُوپے سے بڑھا کر 1.25 کر دی تھی۔ خیال تھا کہ اس طرح تین چوتھائی نقصان کم ہو جائے گا۔ لیکن جب حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ اس طرح تو آدھا نقصان بھی پُورا نہیں ہوتا اور اب بھی فیروز سنز کو رسالے پر ہر مہینے دس ہزار روپے اپنے پلّے سے خرچ کرنا پڑیں گے۔ اس لیے مجبُوراً اس کی قیمت میں مزید 25 پیسے کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ اب ایک پرچے کی قیمت 1.50 ہو گی۔ امّید ہے تعلیم و تربیت پڑھنے والے بچّے یہ اضافہ خوشی سے قبول کریں گے۔ — مینیجر تعلیم و تربیت، 60 شارع قائدِ اعظم، لاہور۔



چچا چھکّن نے پنکچر لگایا

چچا چھکّن کی کہانیاں تو پڑھی تھیں مگر آج تک ایسے بُزرگ کا دیدار نہیں ہُوا تھا۔ لیکن چند دنوں کی بات ہے کہ ہمارے گھر میں سچ مچ کے ایک چچا چھکّن پیدا ہو گئے۔

اب آپ پوچھیں گے کہ وہ کون بزرگ ہیں؟ تو بھئی وہ ہیں ہمارے بھائی جان۔ خدا سلامت رکھے بڑے دِل چسپ اِنسان ہیں۔ عُمر تو کوئی بائیس تیئس سال کی ہو گی۔ ڈاکٹر کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مگر کام ایسے کرتے ہیں جیسے کوئی ساٹھ پینسٹھ سال کا سٹھیایا ہوا بوڑھا۔ اب ذرا ان کا وہ کارنامہ سُنیے جس کی وجہ سے ہم نے ان کا نام چچا چھکّن رکھ دیا ہے۔

ایک دن ہم سکول سے آئے تو گھر میں کچھ گڑبڑ سی دیکھی۔ معلوم ہوا کہ ابّا جان

بس صاحب، یہ کہنا تھا کہ بھائی جان کا غصّہ ایک سو دس ڈگری تک چڑھ گیا۔ پیر پٹخ کر بولے "نالائق، باتیں بناتی ہے۔ جا، جاکر ڈھونڈ۔"

میں نے سارے گھر کی تلاشی لے ڈالی لیکن پمپ کہیں نہ ملا۔ ڈرتے ڈرتے بولی "وہ تو واقعی گھر میں نہیں ہے۔" یہ سُن کر وہ میرے پیچھے لپکے لیکن بھلا ہو سیڑھی کا کہ اس میں ان کی قمیص پھنس گئی اور پیچھے سے نکہت بولی "ارے بھائی جان، پمپ تو آپ کی سیڑھی کے نیچے ہے۔"

بھائی جان جھینپ گئے۔ انھوں نے ٹیوب میں ہَوا بھری اور پھر اُسے پانی میں دبا کر سُوراخ دیکھنا شروع کیا۔ آخر ایک جگہ ہوا کا فوّارہ نکلا۔ بھائی جان گھبرا گئے۔ پھر سنبھل کر پنکچر کو دیکھا جو سُوئی کی نوک کے برابر تھا۔ ان کا چہرہ اس طرح دمکنے لگا جیسے بہت بڑا قلعہ فتح کیا ہو۔ جیب سے پنسل نکال کر پنکچر کے گرد نشان لگایا۔ پھر بے بی کو بُلا کر اس کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا۔ وہ بھاگی بھاگی گئی اور کپڑا سینے کی مشین کھولنے لگی۔ اس کوشش میں مشین کے ڈھکن تلے اس کا ہاتھ دب گیا۔ وہ رونے لگی۔

میں نے اس سے پُوچھا "کیا لینے آئی تھیں؟" مُنھ بسُورتے ہُوئے بولی "بھائی جان نے ...... قینچی لانے کو کہا تھا۔"

میں نے قینچی لے جاکر بھائی جان کے حوالے کی اور انھوں نے خدا خدا کر کے پنکچر لگایا۔ مگر جب ہَوا بھرنے کے لیے پمپ تلاش کرتے ہیں تو وہ ندارد۔ دیکھا تو بے بی اُس سے کُشتی لڑ رہی تھی۔ بھائی جان نے دو چار تھپّڑ اس کے جڑے اور پمپ لے کر ٹیوب میں ہَوا بھری۔ اب "والونٹ" تلاش کرتے ہیں تو وہ غائب۔ بہت سر مارا مگر بے سُود۔ ٹیوب کو ہلا کر دیکھا تو اس میں سے آواز آئی۔ والونٹ ٹیوب کے اندر گھس گیا تھا۔ اب مشکل یہ تھی کہ نکالا کیسے جائے!

آخر دوبارہ پنکچر اُتارا، والونٹ باہر نکالا اور پھر پنکچر لگا کر ٹیوب میں ہَوا بھری۔ آپریشن کامیاب ہو گیا تھا۔ بھائی جان کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وقت دیکھا تو تین بج رہے تھے۔ یعنی آپ نے پورے پانچ گھنٹوں میں ایک ذرا سا پنکچر لگایا۔ اس دن سے سارا گھر آپ کو چچا چھکّن کہنے لگا ہے۔



عِید مُبارک

اکتوبر کی 16 یا 17 تاریخ کو عیدُالفطر ہے۔ اسے چھوٹی عید اور میٹھی عید بھی کہتے ہیں۔ مسلمان یہ عید رمضان کے روزے پُورے ہونے کی خوشی میں مناتے ہیں۔ اس روز آپ کو چاہیے کہ صُبح سویرے اُٹھ کر نہائیں، نئے کپڑے پہنیں اور پھر نماز پڑھنے عیدگاہ جائیں۔ عیدگاہ جانے سے پہلے کھجوریں یا کوئی اور میٹھی چیز کھانا اچھا ہے۔

اس دن مسلمان خدا کی راہ میں صدقۂ فطر دیتے ہیں۔ صدقہ دینا ہر اُس مسلمان پر لازم ہے جس کے پاس ساڑھے باوَن (52) تولے چاندی یا ساڑھے سات تولے سونا ہو۔ ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ گھر کے ہر فرد کے بدلے دو سیر گیہوں یا ان کی قیمت کسی غریب آدمی کو دے۔ صدقۂ فِطر نماز سے پہلے دینا ہی اچھا ہے۔ لیکن نماز کے بعد بھی دیا جا سکتا ہے۔

جب آپ عیدگاہ جائیں تو راستے میں تکبیر پڑھیں: اللّٰہُ اکبر اللّٰہُ اکبر لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَاللّٰہُ اکبَر اللّٰہُ اکبَر وَ لِلّٰہِ الحَمد (اللہ بہت بڑا ہے اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ کے سِوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اللہ بہت بڑا ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے اور اللہ ہی کے لیے تعریفیں ہیں)۔

عیدگاہ یا مسجد میں پہنچ کر جہاں جگہ ملے، بیٹھ جائیے اور جب نماز شروع ہو

تو یہ نیت کیجیے: "میں دو رکعت عید کی واجب نماز چھ تکبیروں کے ساتھ پڑھتا ہوں۔" پھر امام کے ساتھ اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیجیے اور یہ پڑھیے:

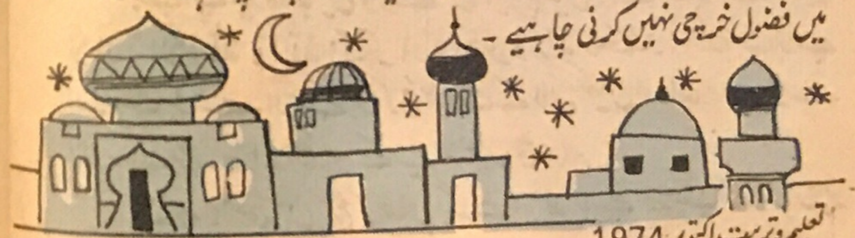
سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَآ اِلٰهَ غَيْرُكَ (الٰہی میں تیری پاکی اور تعریف کے ساتھ تجھے یاد کرتا ہوں۔ تیرا نام برکت والا اور تیری شان اونچی ہے اور تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے)

اس کے بعد خاموش ہو جائیں۔ جب امام تکبیر کہے تو آپ بھی تکبیر کہیے۔ پہلی تکبیر کے ساتھ کانوں تک دونوں ہاتھ اُٹھا کر اللہُ اکبر کہیے اور ہاتھ چھوڑ دیجیے۔ اور پھر ہاتھ اُٹھا کر اللہُ اکبر کہیے اور چھوڑ دیجیے۔ اس کے بعد ہاتھ اٹھا کر اللہُ اکبر کہیے اور ہاتھ باندھ لیجیے۔ اب امام اَلحمد اور سُورت پڑھ کر رکُوع اور سجدہ کرے گا۔ آپ بھی اس کے ساتھ رکوع اور سجدہ کیجیے۔

دوسری رکعت میں امام اَلحمد اور سُورت پڑھے گا اور پھر تکبیر کہے گا۔ پہلی تکبیر میں آپ امام کے ساتھ ہاتھ اُٹھا کر چھوڑ دیجیے۔ دوسری اور تیسری تکبیر میں بھی ایسا ہی کیجیے لیکن چوتھی تکبیر کے ساتھ، بغیر ہاتھ اُٹھائے، اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں چلے جائیے اور نماز پوری کیجیے۔

نماز کے بعد امام دو خطبے پڑھتا ہے جن کا سُننا اتنا ہی ضروری ہے جتنا نماز پڑھنا، اس لیے انھیں نہایت اِطمینان اور خاموشی سے سُنیے۔ خطبے کے بعد اُس راستے سے گھر واپس نہ آئیے جس راستے سے آپ آئے تھے۔ کوئی دوسرا راستہ اِختیار کیجیے۔ ایسا کرنا سُنّت ہے۔

نماز پڑھ کر دوستوں اور عزیزوں کو مُبارک باد دینا اور گلے مِلنا بھی سُنّت ہے۔ خوشی منانا، میلے میں جانا اور دوستوں کو عید کارڈ بھیجنا اچھا ہے، مگر ان کاموں میں فضول خرچی نہیں کرنی چاہیے۔





منشی منقیؒ نے شیر مارا

سعید لخت

مُنشی مُنقیؒ (مُنقّا) تھے تو ڈیڑھ پسلی کے، دھان پان انسان کہ پھونک مارو تو ہوا میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح لہرائیں لیکن اکڑباز اِتنے کہ رُستم زماں گاماں پہلوان سے بھی کشتی لڑنے کو تیار۔ شیخ چلی، خوجی اور سپین کے ڈان کیو ہوٹے کی تو کہانیاں ہی پڑھی تھیں لیکن مُنشی مُنقیؒ کا سا شیخی باز جیتا جاگتا انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا اور نہ شاید کبھی دیکھنا نصیب ہو۔

اب یہ تو خدا ہی کو پتا ہوگا کہ منشی جی کس نسل اور کس ذات کے تھے لیکن وہ خود اپنے آپ کو مُغل بتاتے تھے اور کہتے تھے کہ دنیا میں صرف دو ہی آدمی ایسے رہ گئے ہیں جن کی رگوں میں مغلوں کا خالص خُون دوڑ رہا ہے۔ ایک تو قصبہ فتح پور کے جاگیردار نواب مرزا جہاں دار اور دوسرے خود منشی منقیؒ۔ نواب صاحب خاندانِ مغلیہ کا

آخری چراغ کہلاتے تھے اِس لیے لوگوں نے مُنشی مُنقّی کا لقب "خاندانِ مُغلیہ کی آخری موم بتّی" رکھ دیا تھا۔

مُنشی صاحب کا اصل نام تو کچھ اور تھا لیکن وہ قصبے بھر میں مُنشی مُنقّی کے نام سے مشہُور تھے۔ شاید اس لیے کہ ان کی شکل مُنقّے سے مِلتی جُلتی تھی۔ یا پھر یہ ان کی چڑ تھی۔ وہ محکمۂ جنگلات میں مُنشی تھے اور میرے چچا جان کے ماتحت۔ لیکن مُنشی جی سے ہمارے خاندان کے بہت پُرانے تعلّقات تھے۔ اس لیے ان دونوں میں افسری اور ماتحتی کی کوئی تمیز نہ تھی۔ مُنشی جی اتوار کے اتوار ہمارے گھر آتے، بیٹھک میں محفل جمتی، چائے پانی چلتا اور ساتھ ہی مُنشی جی کی زبان ایسے فراٹے بھرتی کہ رُکنے کا نام نہ لیتی۔ وہ اپنے خاندان کی جُرأت اور دلیری کے وہ وہ کارنامے سُناتے کہ سُننے والوں کی عقل چکرا کر رہ جاتی۔

ایک ایسی ہی محفل میں، ایک دِن، مُنشی جی مُغلوں کی بہادُری اور شجاعت کی داستانیں سُنا رہے تھے کہ ایک دم جلال میں آ گئے اور بولے "ارے میاں، بابر کے ساتھ میرے دادا کے دادا نہ ہوتے تو پانی پت کے میدان میں اُسے اِبراہیم لودھی کے مقابلے میں ہرگز فتح نہ ہوتی۔"

"وہ کیسے مُنشی جی؟" چچا جان نے پُوچھا۔

"وہ ایسے" مُنشی جی بولے "کہ جُونہی ابراہیم لودھی کی فوج نے مُغل فوج پہ حملہ کیا، میرے دادا کے دادا نے ایک دم مشین گن کا فائر کھول دیا اور پلک جھپکتے میں لودھی کی فوج کے دس ہزار جوانوں کو بھُون کر رکھ دیا۔"

میں اس وقت ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بابر کے زمانے میں توپ تو ایجاد ہو چکی تھی اور انھی توپوں کی مدد سے اس نے صرف بارہ ہزار فوج سے لودھی کی ایک لاکھ فوج کو شکست دی تھی، لیکن مشین گن ایجاد نہیں ہوئی تھی۔

چچا جان اور ان کے دوست تو خاموش رہے مگر میں بول پڑا:

"لیکن مُنشی جی، اس وقت مشین گن تھی کہاں؟ مشین گن تو امریکا کے ایک شخص گیٹلنگ نے 1861ء میں ایجاد کی تھی اور بابر اس سے تین سو سال پہلے ہی

مر گیا تھا؟"

مُنشی منقّی نے مجھے گھُور کر دیکھا، اپنی کُچیا داڑھی سہلائی اور پھر آنکھیں نکال کر بولے "لاحَولَ وَلاقوۃ۔ تو تمھیں یہ پڑھایا جاتا ہے سکول میں؟ ارے میاں، اسی لیے تو ہماری قوم نے ترقّی نہیں کی۔ لو جی، یہ چھوکرے سمجھتے ہیں کہ دُنیا میں جتنی ایجادیں ہوئی ہیں وہ سب امریکا اور یورپ والوں نے کی ہیں۔ ہم نے کچھ کیا ہی نہیں۔ ارے برخوردار، امریکا اور یورپ نے جو چیزیں آج ایجاد کی ہیں، وہ ہمارے باپ دادا نے سیکڑوں برس پہلے بنا لی تھیں۔ لو بھلا، یہ صاحب زادے کہتے ہیں کہ اس زمانے میں مشین گن نہیں تھی۔ ارے میاں، اس زمانے میں تو ہوائی جہاز بھی تھے اور بھاپ سے چلنے والے بحری جہاز بھی جو سمندروں کی چھاتی پر مُونگ دلتے پھرتے تھے۔ تم نے الف لیلہ کی کہانیوں میں اُڑن قالینوں اور اُڑن کھٹولوں کے متعلّق نہیں پڑھا ہے؟ یہ اڑن کھٹولے کیا تھے؟ یہ ہوائی جہاز تھے اور ان میں جٹ انجن لگے تھے۔



لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے انھیں جادُو کی چیزیں سمجھتے ہیں اور سُنو، علّامہ اقبال نے کہا ہے:

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظُلمات میں دوڑا دِیے گھوڑے ہم نے

اب بتاؤ کہیں بحر یعنی سمندر میں گھوڑے دوڑ سکتے ہیں؟ اقبال جیسا لائق

شاعر ایسی بات ہرگز نہیں کہہ سکتا۔ اصل میں اس سے مُراد بھاپ سے چلنے والے جہاز ہیں، جہاز۔ کیا سمجھے؟"

چچا جان نے ہنسی روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ ان کے ہونٹوں کا بند توڑ کر نکل ہی گئی۔ دوسرے لوگ بھی ہنسنے لگے۔ میں نے مسکرا کر گردن جُھکالی۔

تو یہ تھے مُنشی منطقی اور یہ تھیں ان کی مزے دار باتیں۔ اب سنیے، انھی دنوں ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے آس پاس کی ساری بستیوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ ہمارے قصبے سے چار پانچ میل پرے جنگل شروع ہو جاتا تھا اور اس کے ارد گرد بہت سے چھوٹے موٹے گاؤں آباد تھے۔ اس جنگل میں خُدا جانے کہاں سے ایک بھُوکا ننگا شیر آگیا اور لگا گاؤں والوں کے ڈھور ڈنگروں پر ہاتھ صاف کرنے۔ کسان ڈر کے مارے، سرِ شام ہی، ڈنگروں کو لے کر گھر لوٹ آتے تھے اور بڑے سے بڑا جی دار جوان بھی رات کو باہر نکلنے کی جُرأت نہ کرتا تھا۔

جب شیر نے کسانوں کی بہت سی بھیڑ بکریاں اور گائیں ہڑپ کر گیا تو انھوں نے دُہائی مچا دی اور ہوتے ہوتے یہ خبر علاقے کے ڈپٹی کمشنر تک پہنچی۔ انھوں نے چچا جان کو حکم دیا کہ ہفتے کے اندر اندر اس خبیث شیر کو زندہ یا مردہ ہماری خدمت میں پیش کیا جائے۔

یہ سُن کر چچا جان کی اُوپر کی سانس اُوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ انھوں نے کبھی خواب میں بھی شیر کا شکار نہ کیا تھا۔ عُمر بھر تیتر بٹیر یا زیادہ سے زیادہ خرگوش مارے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے پاس وہ بندوق تھی ہی نہیں جس سے شیر کا شکار کیا جاتا ہے۔ وہ بہت گھبرائے اور فوراً اپنے دوستوں کی میٹنگ بلائی۔ اس میٹنگ میں منشی منطقی بھی تھے۔

منشی صاحب نے چچا جان کی باتیں بڑے غور سے سُنیں اور پھر کہا کہ جنگل میں جگہ جگہ پھندے یا جال لگا دیے جائیں اور جب شیر کسی پھندے میں پھنس جائے تو اُسے بوری میں بند کر کے ڈپٹی کمشنر صاحب کو بھیج دیا جائے۔ منشی جی نے بڑی سنجیدگی سے بتایا کہ ملکہ نور جہاں کے پہلے شوہر، شیر افگن، نے اسی ترکیب سے شیر مارا تھا اور یہ

ترکیب اُسے منشی جی کے کسی دادا نے بتائی تھی۔ ترکیب تھی تو ٹھیک لیکن اس کے لیے بہت سے جالوں اور پھندوں کی ضرورت پڑتی اور پھر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ شیر کو بوری میں کون بند کرتا! اس لیے چچا جان اور ان کے دوستوں نے مُنشی جی کی یہ ترکیب رد کر دی۔

جب منشی جی چلے گئے تو چچا جان نے دوستوں سے صلاح کی اور آخر طے یہ ہُوا کہ ہم جنگل میں ضرور جائیں گے۔ درختوں پر مچان بھی بنائیں گے لیکن شیر ہرگز نہیں ماریں گے کیوں کہ وہ ہم سے نہیں مرے گا۔ بس دو تین دن یونہی مچانوں پر بیٹھ کر واپس آ جائیں گے اور ڈپٹی صاحب سے کہہ دیں گے کہ جناب، یہ مُوذی شیر ہمارے بس کی بات نہیں۔ اسے مارنے کے لیے تو کینتھ اینڈرسن اور جم کاربٹ جیسے تجربہ کار شکاریوں کی ضرورت ہے لہٰذا انھیں تار دے کر انگلستان سے بُلوایا جائے۔



یہ فیصلہ کر کے سب نے اطمینان کی سانس لی اور دوسرے دن، صبح کو، بوریا بستر باندھ کر جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ میری چھٹیاں تھیں۔ میں نے چچا جان کی خوشامد کی کہ مجھے بھی لے چلیے۔ پہلے تو انھوں نے انکار کیا لیکن پھر یہ سوچ کر کہ ہمیں کون سا سچ مچ کا شکار کرنا ہے، مان گئے۔ برسات کا موسم تھا اس لیے منشی منطقی نے اپنی چھتری، جس پر بھیانک رنگ کا کالا سیاہ کپڑا چڑھا ہُوا تھا، ساتھ لے لی۔

ایک گھنٹے بعد ہم لوگ جنگل کے قریب ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ چچا جان نے

دیہاتیوں کو بتایا کہ اب ہم آ گئے ہیں اور انشاء اللہ شیر کو مار کر ہی واپس جائیں گے۔ لہٰذا فکر کی کوئی بات نہیں۔ بس تم اتنا کرو کہ ہمیں تین چار ہٹے کٹے جوان دے دو جو جنگل میں جا کر ہمارے لیے مچان بنا دیں اور ایک موٹا تازہ بکرا بھی لا دو تاکہ شیر اس کی بو سونگھ کر مچانوں تک آ جائے اور ہم اسے ڈٹ کر گولی مار دیں۔ ایک دیہاتی نے بتایا کہ اس نے شیر کو کل رات جنگل میں برساتی نالے کے پاس ٹہلتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ وہیں کہیں چھپا بیٹھا ہوگا لہٰذا اسی جگہ مچان بنائے جائیں۔

دیہاتی ہماری پارٹی کو جنگل میں اس جگہ لے گئے جہاں برساتی نالا تھا۔ اس نالے کے کنارے دو اونچے اونچے درخت تھے۔ انھی درختوں پہ انھوں نے ہمارے لیے مچان بنا دیے۔

منشی جی کی رائے تھی کہ بکرے کو باندھا نہ جائے، کھلا چھوڑ دیا جائے۔ وہ جنگل میں گھومتا پھرے اور شیر اس کی طرف لپکے تو وہ دوڑ کر مچان تک آ جائے اور ہم شیر کو گولی مار دیں۔ لیکن افسوس چچا جان نے منشی جی کی یہ تجویز بھی نہیں مانی کیوں کہ اس کے لیے بکرے کو ٹریننگ دینے کی ضرورت تھی اور اس ٹریننگ میں سال چھ مہینے لگ جاتے۔

خیر صاحب، بکرے کو ایک جھاڑی سے باندھ دیا گیا اور سب لوگ، کھانا کھا کر، مچانوں پر چڑھ کر بیٹھ گئے۔ چاندنی رات تھی۔ ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ شمال کی طرف والے مچان پر چچا جان، ان کا ایک دوست اور میں بیٹھا تھا اور جنوب کی طرف والے مچان پر منشی منقی اور ایک اور صاحب براجمان تھے۔ اسی مچان کے پاس بکرا بندھا ممیا رہا تھا۔

میرے خیال میں دس گیارہ کا وقت ہوگا کہ بکرا زور سے ممیایا۔ ساتھ ہی قریب کی ایک جھاڑی میں سرسراہٹ ہوئی۔ پھر جھاڑی میں سے کسی جانور کا سر نکلا، اس کے بعد دھڑ اور پھر دُم۔ یہ شیر تھا۔ میری روح فنا ہو گئی۔ ڈرتے ڈرتے چچا جان اور ان کے دوست کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کی حالت بھی غیر تھی۔

شیر آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا بکرے کی جانب بڑھا۔ بے چارے بکرے کا خوف

سے خون خشک ہو گیا تھا اور وہ بُت بنا شیر کو دیکھ رہا تھا۔ شیر چند سکنڈ بکرے کو دیکھتا رہا۔ پھر بڑے مزے سے جمائیاں لیتا ہوا اس درخت کی طرف بڑھا جس پر منشی منقی بیٹھے تھے۔ ابھی وہ درخت سے چند گز کے فاصلے پر تھا کہ دھم کی آواز آئی۔ منشی منقی درخت سے لڑھک کر زمین پر گر پڑے تھے!

میں اس وقت کا منظر بیان نہیں کر سکتا۔ شیر غصے سے دُم ہلا رہا تھا اور اس سے دس بارہ گز کے فاصلے پر منشی منقی چھتری ہاتھ میں لیے مٹک مٹک کر اسے دھمکا رہے تھے "دھت دھت۔ ابے دھت!" انھوں نے چھتری شیر کی طرف اس طرح تان رکھی تھی جیسے وہ کوئی بندوق ہو۔

منشی جی کبھی دایاں پیر زمین پر مارتے اور کبھی بایاں۔ کبھی کولہے مٹکاتے تو کبھی گردن۔ اس دوران میں ان کی چھتری کا رُخ شیر کی طرف رہا اور وہ منھ سے "دھت دھت" کی آوازیں بھی نکالتے رہے۔

شیر پندرہ بیس سکنڈ خاموش کھڑا دُم ہلاتا رہا۔ وہ شاید یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ منشی منقی کون سا رقص کر رہے ہیں؟ بھنگڑا، لُڈی یا خٹک؟ منشی جی اسی طرح دھت دھت کرتے اور پینترے بدلتے بکرے کے پاس پہنچ گئے۔ بکرے کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس نے گردن جھکا کر ٹکر جو ماری تو منشی جی 5 فٹ اوپر اچھل پڑے اور اس کے ساتھ ہی ان کا کمر بند ٹوٹ گیا۔ اب وہ ایک ہاتھ سے پاجامہ پکڑے ہوئے تھے اور دوسرے ہاتھ سے چھتری۔ ساتھ ہی "دھت دھت ابے دھت!" کیے جا رہے تھے۔ اگر چچا جان میری کوکھ میں کہنی نہ مارتے تو میری ہنسی نکل گئی ہوتی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیر اب منشی منقی کے ناچ سے اکتا گیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تو کھڑا دُم ہلاتا رہا۔ ایک دو مرتبہ اس کے منھ سے غوں غاں کی آواز بھی نکلی۔ پھر اس نے اگلے پنجوں سے مٹی کریدی، پچھلی ٹانگیں سمیٹیں اور ایک خوف ناک چیخ مار کر منشی منقی پر چھلانگ لگا دی۔ منشی جی بھی غافل نہیں تھے۔ شیر ابھی آدھے ہی راستے میں تھا کہ انھوں نے کھٹاک سے چھتری کھولی اور اس کا رُخ شیر کی طرف کر دیا۔

شیر نے ایسا خوف ناک ہتھیار پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ چھتری کے اچانک کھلنے

اوراس کے کالے کپڑے سے وہ ایسا بوکھلایا کہ راستے ہی میں اُلٹی قلابازی لگائی اور دل ہلا دینے والی چیخیں مارتا ہوا جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ اس کی پہلی دہاڑ ایک فرلانگ کے فاصلے پر سنائی دی، پھر دو فرلانگ پر اور اسی طرح دُور ہوتے ہوتے بالکل غائب ہو گئی۔

ہم اپنی اپنی جگہ سہمے بیٹھے تھے، لیکن مُنشی جی برابر بنکارے جا رہے تھے، "اُبے ایک ہی جھونک میں بھاگ گیا! مرد ہے تو میدان میں آ! قسم ہے دادا جان کی، وہ خبر لوں کہ عُمر بھر یاد رکھے۔ مغل بچہ ہوں مغل بچہ۔ مذاق نہیں۔"

پہلے چچا جان مچان سے اترے اور پھر دوسرے لوگ۔ انھوں نے منشی جی کو کاندھوں پر اُٹھا لیا اور زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے گاؤں میں آئے۔

اُس دن سے شیر ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ہم دو تین روز گاؤں میں رہے اور پھر گھر واپس آ گئے۔ جب ایک ہفتے تک کسی کا ڈھور ڈنگر غائب ہونے کی خبر نہ آئی تو چچا جان نے ڈپٹی صاحب کو کہلا بھیجا کہ شیر زخمی ہو کر جنگل سے بھاگ گیا ہے لہٰذا اب تشویش کی کوئی بات نہیں۔

اس واقعے کے بعد منشی منقّی کی اکڑ اور بڑھ گئی۔ وہ سارے قصبے میں اینڈے اینڈے پھرتے اور سینہ پُھلا کر بڑے فخر سے کہتے "یونہی تو نہیں کہتا تھا کہ مغل بچہ ہوں۔ میرے ایک ہی گھونسے نے شیر کا کچُومر نکال دیا۔ اب وہ کبھی اِدھر نہیں آئے گا۔ اگر آ گیا تو میرا نام بدل دینا۔"

اور سچ مچ شیر اس جنگل میں پھر کبھی نہیں آیا اور نہ لوگوں کو مُنشی جی کا نام بدلنے کی ضرورت پڑی۔ وہ بدستور منشی مُنقّی ہی کہلاتے رہے۔



راجا

راجا ماں باپ کا دُلارا ہے — آنکھ کا اُن کی ایک تارا ہے
کیا بتاؤں وہ کتنا پیارا ہے — کُنبہ قربان اُس پہ سارا ہے
راجا ماں باپ کا دُلارا ہے

گھر ہمارے وہ روز آتا ہے — اپنی امّی کو ساتھ لاتا ہے
میز پر چڑھ کے مُسکراتا ہے — بسکٹوں پر نظر جماتا ہے
راجا ماں باپ کا دُلارا ہے

کھیلتا ہے شعیب سے ہر دم — اُس کا اِک اور دوست ہے اعظم
گود کی سَمت جب اُٹھائے قدم — دیکھیے ماں کے پیار کا عالم
راجا ماں باپ کا دُلارا ہے

اُس سے کرتے ہیں پیار ہمسائے — جو اُسے دیکھے، دیکھتا جائے
کوئی صابن سے اس کو نہلائے — کوئی پوڈر سے چہرہ چمکائے
راجا ماں باپ کا دُلارا ہے

گندگی سے وہ دُور رہتا ہے — صاف سُتھرا ضرور رہتا ہے
وہ کسی دُھن میں چُور رہتا ہے — دل میں اس کے سُرور رہتا ہے
راجا ماں باپ کا دُلارا ہے

(سرُور بجنوری)



20 سال کی عمر کے ہاتھیوں کو پکڑ کر سدھایا جاتا ہے۔ کیوں کہ
ی " (ہاتھی بان)، کے اشاروں کو سمجھنے اور بوجھ ڈھونے کے
مپ کی سدھی ہوئی ہتھنیوں کے بچوں کے مقابلے میں جنگلی
ت کٹھن کام ہے اور اس کے لیے بڑے صبر اور مہارت کی

ے ہوئے ہاتھی کو کیمپ میں لا کر کسی مضبوط درخت کے ساتھ
سے دو ایک دن بھوکا رکھا جاتا ہے۔ پہلے پہل تو ہاتھی خوب
یں تڑا کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جب وہ یہ دیکھتا

ہے کہ بھاگ نکلنے کی کوئی صورت نہیں اور اسے اپنی بقیہ زندگی اب قید ہی میں بسر کرنی ہے تو صبر شکر کر کے خاموش ہو جاتا ہے اور اوزی سے کیلے لے کر کھانے لگتا ہے۔ اس کے دو تین روز بعد اُسے سدھانے کا کام شروع ہوتا ہے۔

ہاتھی سدھانے والے درخت کے اِرد گِرد موٹی موٹی لکڑیاں گاڑ کر باڑا یا پنجرا سا بنا دیتے ہیں۔ اس باڑے کے اُوپر، درخت کی شاخ میں، چرخی لگی ہوتی ہے۔ ہاتھی کے "اُوزی" کو رسّی سے باندھ کر، چرخی کے ذریعے اُوپر چڑھایا جاتا ہے۔ ایک آدمی ہاتھی کی سُونڈ پر ہاتھ پھیرتا رہتا ہے اور دوسرا اُسے کیلے کھلاتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ اب ہاتھی کی اکڑ فوں ختم ہو گئی ہے تو وہ رسّی کو آہستہ آہستہ ڈھیل دیتے ہیں۔ اُوپر ٹنگا ہوا "اُوزی" دِھیرے دِھیرے نیچے آتا ہے اور ہاتھی کی گردن پر بیٹھ جاتا ہے۔

جنگلی ہاتھی کی گردن پر کسی آدمی کا سوار ہونا، اس ہاتھی کے لیے ایک انوکھی بات ہوتی ہے۔ وہ خوف زدہ ہو کر زور زور سے اُچھلتا ہے اور بُری طرح چیخیں مارتا ہے۔ اس پر سدھانے والے رسّی کھینچ کر اوزی کو اُوپر اُٹھا لیتے ہیں۔ ایک آدمی ہاتھی کو چمکارتا ہے اور دُوسرا اُسے کیلے دیتا ہے اور جب ہاتھی خاموش ہو جاتا ہے تو پھر اوزی کو اس کی گردن پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ ہاتھی گھبرا کر اچھلتا ہے تو سدھانے والے رسّی کھینچ کر اُوزی کو اُوپر اُٹھا لیتے ہیں۔ یہ عمل بار بار دہرایا جاتا ہے، یہاں تک کہ ہاتھی عاجز آ کر ان کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور چپ چاپ کھڑا ہو جاتا ہے، جیسے کہہ رہا ہو "اگر تم نہیں مانتے تو چلو یونہی سہی۔ بیٹھ جاؤ میری گردن پر۔"

اس کے بعد اُسے بیٹھنے اور کھڑے ہونے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ اوزی اس کی گردن پر ہاتھ مار کر کہتا ہے "ہمِت!" (بیٹھ جاؤ)، ہاتھی اس کا مطلب نہیں سمجھتا۔ اور جھومتا رہتا ہے۔ اُوزی پھر اُسے حکم دیتا ہے "ہمِت!"۔ جب وہ بار بار یہی کہتا ہے تو ہاتھی مجبوراً بیٹھ جاتا ہے۔ اس پر سدھانے والے خوش ہو کر تالیاں بجاتے ہیں۔ اب اوزی اُسے کھڑے ہونے کو کہتا ہے۔ وہ اس کی گردن پر ہاتھ مار کر حکم دیتا ہے "ناہ!" (کھڑے ہو)، اور آخر ایک آدھ گھنٹے کی کوشش کے بعد ہاتھی "ناہ"

کا مطلب بھی سمجھ جاتا ہے۔ اب دن بھر تاہ تاہ اور ہمت ہمت ہوتی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ ہاتھی ان لفظوں کا مطلب دماغ میں بٹھا لیتا ہے۔ تاہ سُن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ہمت کہو تو بیٹھ جاتا ہے۔ یہ ٹریننگ (تربیت، سکھلائی) ہفتوں جاری رہتی ہے اور جب ہاتھی کی وحشت دُور ہو جاتی ہے اور وہ انسانوں سے مانوس ہو جاتا ہے تو پھر اسے میدان میں چلا پھرا کر بوجھ ڈھونے کی مشق کرائی جاتی ہے۔

25 سال کی عُمر میں ہاتھی 24-25 الفاظ کا مطلب سمجھنے لگتا ہے۔ بعض ہاتھی



بہت ذہین ہوتے ہیں۔ وہ زمین پر پڑی ہوئی چیزیں اُٹھا کر اپنی گردن پہ بیٹھے ہوئے اوزی کو دے دیتے ہیں۔ میں نے ایک ایسا عقل مند ہاتھی دیکھا جو نہ صرف پائپ بلکہ جلتا ہوا سگریٹ زمین پر سے اُٹھا کر اپنے سوار کو دے دیتا تھا۔

میں آپ کو (پچھلے مہینے) بتا چکا ہُوں کہ اوزی اپنے ہاتھی کی گردن میں گھنٹی

باندھ دیتے ہیں تاکہ جب ہاتھی جنگل میں کُھلا پھر رہا ہو تو گھنٹی کی آواز سے سمجھ جائیں کہ وہ کہاں ہے۔ اس گھنٹی کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جب ہاتھی کسی کھیت یا باغ میں گُھس جاتے ہیں تو رکھوالے کو خبر ہو جاتی ہے اور وہ انھیں ڈرا دھمکا کر نکال دیتا ہے۔ لیکن بعض ذہین اور شریر ہاتھی اپنی گھنٹیاں توڑ کر پھینک دیتے ہیں اور رات کو کیلوں کے باغ میں گُھس کر خوب موج اُڑاتے ہیں۔ چوں کہ ان کے گلے میں گھنٹیاں نہیں ہوتیں اس لیے چوکیدار کو پتا نہیں چلتا کہ اس کا باغ اُجاڑا جا رہا ہے۔

میں نے ہاتھیوں کی عقل مندی اور ذہانت کے یوں تو بہت سے واقعات دیکھے ہیں، لیکن ان میں سے صرف دو ایک آپ کو سُناتا ہُوں۔ ایک دفعہ شہر میں سرکس آیا تو میں بھی دیکھنے چلا گیا۔ پہلے دوسرے تماشے دکھائے گئے اور اس کے بعد ہاتھیوں کے کرتب کی باری آئی۔ چار پانچ گرانڈیل ہاتھی جھُومتے جھامتے رِنگ میں داخل ہوئے تماشائیوں نے محسوس کیا کہ ان میں سے ایک ہاتھی کھیل میں دل چسپی نہیں لے رہا ہے وہ رِنگ ماسٹر کے اشاروں پر توجُّہ دینے کے بجائے تماشائیوں کو دیکھ رہا تھا۔

اچانک اس ہاتھی نے سُونڈ اُٹھائی، خوشی سے چنگھاڑا اور رِنگ میں سے نِکل کر تماشائیوں کی طرف لپکا۔ تمام لوگ چُپ چاپ دم سادھے بیٹھے رہے۔ ہاتھی جھومتا جھامتا تھرڈ کلاس میں گیا، وہاں سے ایک آدمی کو سُونڈ میں اُٹھا کر لایا اور سب سے آگے، فسٹ کلاس کے ایک خالی صوفے پر، اُسے بٹھا دیا۔ تماشائی خوشی کے مارے پاگل ہو گئے اور کھڑے ہو کر کئی منٹ تک تالیاں بجاتے رہے۔

بعد میں مجھے معلوم ہُوا کہ یہ شخص اس ہاتھی کو بہت پیار کرتا تھا۔ وہ روز، دِن کے وقت، سرکس میں آتا، ہاتھی کو کیلے کِھلاتا اور دیر تک اس سے باتیں کرتا رہتا۔ تقریبًا ہر دوسرے تیسرے دن وہ سرکس دیکھنے آتا تھا اور ہمیشہ سب سے آگے فسٹ کلاس میں بیٹھتا تھا۔ اُس دن شاید اس کے پاس پیسے کم تھے اس لیے وہ تھرڈ کلاس میں بیٹھ گیا۔ اس کا دوست ہاتھی بھلا یہ کب گوارا کر سکتا تھا۔ اس نے اُسے اُٹھا کر فسٹ کلاس میں بٹھا دیا۔

اس سے بھی زیادہ عجیب واقعہ اس ہتھنی کا ہے جس کا بچّہ پہاڑی ندی کی بپھری

ہُوئی موجوں میں پھنس گیا تھا اور ہتھنی نے بڑی ہوشیاری اور عقل مندی سے اُسے موت کے مُنھ سے بچایا تھا۔

ہُوا یوں کہ ایک دِن اپرٹانڈون ندی میں سیلاب آگیا۔ میرا کیمپ اسی ندی کے کنارے پر تھا۔ میں کیمپ میں بیٹھا ندی کی غضب ناک موجوں کا شور سن رہا تھا کہ اچانک کسی ہاتھی کے زور زور سے چنگھاڑنے کی آواز آئی۔ باہر نکل کر، میں نے،



اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر سرپٹ ندی کی طرف دوڑا۔ یہاں ندی کے دونوں کناروں پر اُونچی اُونچی چٹانیں تھیں اور انھی چٹانوں کے نیچے سے ہاتھی کی چیخوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں جلدی سے ایک چٹان پر چڑھا، نیچے جُھک کر دیکھا اور پھر ———— دیکھتا ہی رہ گیا۔

پہاڑی ندی کی تیز و تند موجوں کے درمیان ہمارے کیمپ کی ایک ہتھنی کھڑی چنگھاڑ رہی تھی اور اس نے اپنی سُونڈ میں اپنا تین مہینے کا بچہ اٹھا رکھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں ماں بیٹے پانی پینے آئے تھے کہ سیلاب میں پھنس گئے۔

ہتھنی جس جگہ کھڑی تھی وہاں پانی سات آٹھ فٹ گہرا تھا اور اس کا بہاؤ اِتنا تیز تھا کہ بھاری بھرکم ہتھنی لڑکھڑا رہی تھی۔ یکایک پانی کا ایک زبردست ریلا آیا جس سے ہتھنی ڈگمگا گئی اور اس کی سُونڈ سے بچہ چھُوٹ کر پانی میں گر پڑا۔

اس وقت کا منظر میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ پانی بچّے کو بہائے لیے جارہا تھا اور مامتا کی ماری ماں اُس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ آخر پچاس ساٹھ گز دُور اس نے بچّے کو جالیا اور سونڈ میں جکڑ کر پانی سے اُوپر اُٹھا لیا۔

یہاں دریا کا کنارہ صرف 4-5 فٹ اُونچا تھا۔ ہتھنی بچّے کو سُونڈ میں اُٹھائے بڑی مشکل سے کنارے تک آئی، پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر اگلا پیر کنارے کی چٹان پر ٹکایا اور پھر پوری طاقت سے سُونڈ اٹھا کر بچّے کو چٹان پر ڈال دیا۔

اس پہاڑی ندی میں جس تیزی سے پانی چڑھتا ہے، اسی تیزی سے اُتر بھی جاتا ہے۔ دس پندرہ منٹ بعد پانی کا زور گھٹ گیا اور ندی کی سطح کم ہونے لگی۔ ہتھنی شاید اسی کے انتظار میں تھی۔ پانی کم ہوتے ہی وہ کنارے پر چڑھ آئی۔ اُس وقت ماں کی ممتا دیکھنے سے تعلّق رکھتی تھی۔ ہتھنی مارے خوشی کے کبھی بچّے کے اِرد گرد چکّر کاٹتی، کبھی اس کے سر پر پیار سے سُونڈ مارتی اور کبھی خوشی سے چیخنے لگتی۔ یہ دیکھ کر مجُھ جیسے سخت دِل اِنسان کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔



س: دُنیا میں آزاد مُلک کتنے ہیں؟
ج: 228

س: سب سے بڑا ملک کون سا ہے؟
ج: آبادی کے لحاظ سے چین اور رقبے کے لحاظ سے رُوس۔

س: زمین سُورج سے کتنی دُور ہے؟
ج: ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل۔

س: زمین سُورج کے گرد ایک چکّر کاٹنے میں کتنا فاصلہ طے کرتی ہے؟
ج: 583,825,765 میل

س: کس مُلک میں سینماؤں کی تعداد سب سے زیادہ ہے؟
ج: رُوس، جہاں ایک لاکھ پچاس ہزار سینما گھر ہیں۔

س: دُنیا کے وہ کون سے مُلک ہیں جہاں تقریبًا تمام لوگ پڑھے لکھے ہیں؟
ج: امریکا، رُوس، برطانیہ، ناروے، سویڈن، ہالینڈ، آئرلینڈ، جرمنی ڈنمارک، آسٹریا، آسٹریلیا اور جاپان۔

س: دُنیا کا وہ کون سا ملک ہے جہاں اَن پڑھ لوگ سب سے زیادہ ہیں؟
ج: لائبیریا۔ جہاں 95 فی صد آبادی اَن پڑھ ہے۔

س: دنیا کا سب سے امیر مُلک کون سا ہے؟
ج: امریکا، جہاں ایک آدمی کی اوسط آمدنی فی سال ۴۰۰۰ ڈالر ہے۔
(۱ ڈالر = تقریبًا دس رُوپے)

س: زمین پہ زندگی کے آثار کب پیدا ہُوئے؟
ج: ۲۰۰ کروڑ سال پہلے۔

س: زمین پر خشکی زیادہ ہے یا پانی؟
ج: پانی، جو تمام زمین کے 71 فیصد حصّے پر پھیلا ہُوا ہے۔

س: دُنیا کا سب سے لمبا آدمی کون

ہے ؟

ج : امریکا کا ایک شخص، رابرٹ پرشنگ جو ۹ فٹ لمبا ہے۔

س : دُنیا کا سب سے چھوٹے قد کا مرد کون تھا ؟

ج : امریکا کا ایک شخص، کالون فلپ اس کا قد ۲ فٹ 2½ انچ تھا۔

س : دُنیا کا سب سے موٹا آدمی کون تھا ؟

ج : امریکا کا ایک شخص رابرٹ ارل ہیوگ، جو 1958ء میں فوت ہُوا۔ اس کا وزن 12½ من تھا۔

س : دنیا میں سب سے لمبی عمر کس شخص نے پائی ؟

ج : 1933ء میں چین کے شہر پیکنگ میں، ایک شخص چنگ یُون 256 سال کی عمر میں فوت ہُوا۔

س : دُنیا میں زیادہ سے زیادہ سونے کا ریکارڈ کس نے قائم کیا ؟

ج : امریکا کے ایک شخص ہومس نے جو لگاتار ۳۰ سال تک سوتا رہا۔

س : دنیا میں مُتواتر جاگتے رہنے کا ریکارڈ کس نے قائم کیا ؟

ج : انگلستان کے ایک شخص یُو۔ آر۔ برنٹ نے جو 1965ء میں فوت ہُوا۔ وہ مُتواتر 58 سال جاگتا رہا۔

س : دُنیا میں ایک سال میں کتنے بچّے پیدا ہوتے ہیں ؟

ج : 5 کروڑ۔

س : دُنیا میں ایک سال میں کتنے آدمی مرتے ہیں ؟

ج : 2 کروڑ۔

س : دنیا میں کُل کتنے چڑیا گھر ہیں ؟

ج : 500

س : دُنیا کا سب سے بڑا چڑیا گھر کہاں ہے ؟

ج : نیویارک میں۔

س : پاکستان میں سب سے بڑا چڑیا گھر کہاں ہے ؟

ج : لاہور میں۔

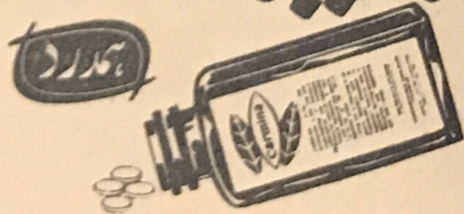
س : پاکستان میں ریڈیو سٹیشن کہاں کہاں ہیں ؟

ج : کراچی۔ حیدرآباد۔ کوئٹہ۔ ملتان۔ لاہور۔ راولپنڈی (اسلام آباد)۔ پشاور۔

س : دُنیا میں مسلمانوں کی آبادی کتنی ہے ؟

ج : 75 کروڑ۔







تھور کا ہتھوڑا

پُرانے زمانے کے یُونانیوں، مصریوں، عربوں اور ہندوؤں کی طرح وائی کِنگ بھی بہت سے دیوی دیوتاؤں کو مانتے تھے۔ ان میں ایک بجلی کی کڑک کا دیوتا "تھور" بھی تھا۔ اسی دیوتا کے حکم سے دُنیا میں موسم بدلتے تھے۔

وائی کِنگ کے یہ تمام دیوتا، اُوپر آسمان پر، ایک بہت بڑے اور خوب صُورت محل میں رہتے تھے، جسے "اسگرڈ" کہا جاتا تھا۔ زمین پر انسان اور دیو بستے تھے اور زمین کے نیچے، پاتال میں، شیطانوں کی بستی تھی۔ آسمان اور زمین کے درمیان دیوتاؤں نے دھنک (قوسِ قزح) تان دی تھی جس کے ذریعے وہ زمین اور آسمان پر آتے جاتے تھے۔

ایک دفعہ بجلی کی کڑک کے دیوتا تھور کا وہ ہتھوڑا گُم ہو گیا جسے وہ بادلوں پر مار کر گرج اور کڑک پیدا کرتا تھا۔ اس ہتھوڑے میں اس غضب کی طاقت تھی کہ اس کے ایک ہی وار سے بڑے سے بڑے پہاڑ کے دو ٹکڑے ہو جاتے تھے۔

جب سے تھور کا یہ ہتھوڑا گم ہوا تھا وہ زخمی شیر کی طرح محل میں گھوم رہا تھا اور کسی کی ہمّت نہ تھی کہ اس کے سامنے آتا۔

جب یہ خبر آگ کے دیوتا، لوکی، نے سُنی تو اس نے تھور کی مدد کرنے کی ٹھانی۔ لوکی بہت چالاک اور مکّار تھا۔ شیطانی اس کی رگ رگ میں رچی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا اگر میں کسی ترکیب سے تھور کا ہتھوڑا تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا تو وہ مجھ سے خوش ہو جائے گا اور ضرورت کے وقت میری مدد کرے گا۔

لوکی تھور کے پاس گیا، اُسے تسلّی دی اور کہا، "معلوم ہوتا ہے زمین کے کسی دیو یا پاتال کے کسی شیطان کی یہ حرکت ہے۔ میں ابھی جا کر معلوم کرتا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔

لوکی فوراً زمین پر آیا اور چند دن کی دوڑ دھوپ کے بعد اس نے معلوم کر لیا کہ دیووں کا بادشاہ، تھرم، تھور کا ہتھوڑا چرا کر لے آیا ہے۔ تھرم بہت بدصُورت اور خوف ناک دیو تھا۔ وہ ایک اونچی سی پہاڑی پر رہتا تھا۔

لوکی واپس دیوتاؤں کے محل میں آیا اور تھور کو ساری بات بتائی۔ کڑک کا دیوتا تھور غصّے سے کانپ اُٹھا۔ اس کے نتھنوں سے شعلے نکلنے لگے اور آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اس نے گرج کر کہا "اس خبیث دیو کی اتنی ہمت! میں ابھی جا کر اس کی ہڈی پسلی ایک کرتا ہوں۔"

"ذرا ٹھہریے، بڑے بھائی۔" لوکی نے ہاتھ اُٹھا کر کہا "غصّے میں کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھیے گا کہ بعد میں پچھتانا پڑے۔ آپ دیوتا ہیں تو تھرم بھی دیووں کا بادشاہ ہے۔ ذرا سوچ سمجھ کر قدم اُٹھائیے۔ آپ جانتے ہیں کہ بعض وقت مکّاری وہ کام کر جاتی ہے جو طاقت نہیں کر سکتی۔ میں جا کر تھرم سے ملتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ وہ ہتھوڑے کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اس کے بعد ہم کوئی ایسی ترکیب سوچیں گے کہ

آپ کا ہتھوڑا آپ کو واپس مل جائے ۔"

یہ کہہ کر وہ بڑا سا پرندہ بن گیا، تیزی سے اُڑتا ہوا زمین پر آیا اور تھرم کے محل کی بُرجی پر بیٹھ گیا۔ مگر تھرم اس سے بھی زیادہ ہوشیار نکلا۔ اس نے جھٹ اُسے پہچان لیا اور بولا "تم آگ کے دیوتا لوکی ہو۔ میں نے تمھیں پہچان لیا ہے اور میں یہ بھی سمجھ گیا ہُوں کہ تم یہاں کیوں آئے ہو۔ اگر تم دیوتا تھور کا ہتھوڑا لینا چاہتے ہو تو تمھیں میری ایک شرط پوری کرنا پڑے گی ۔"

"کون سی شرط ؟" لوکی نے پُوچھا۔

"میں موسمِ بہار کی دیوی فریا سے شادی کرنا چاہتا ہوں ۔" تھرم کہنے لگا "دیوتاؤں سے کہو فریا کو میرے حوالے کر دیں۔ اس کے بغیر میں تھور کا ہتھوڑا واپس نہیں کروں گا ۔"

یہ سُن کر لوکی وہشت سے کانپ اُٹھا۔ فریا تمام دیویوں میں سب سے زیادہ خُوب صُورت اور نازک تھی، اور تھرم سے زیادہ بدصُورت شاید ہی دُنیا میں اور کوئی مخلُوق ہو۔

چالاک لوکی نے اپنے دِل کی بات چہرے سے ظاہر نہ ہونے دی مُسکرا کر کہنے لگا "جناب، یہ تو بہت معمُولی بات ہے۔ میں ابھی جا کر دیوتاؤں سے کہتا ہُوں جہاں تک میری ذات کا تعلّق ہے، تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں سمجھتا ہُوں کہ ہم دیوتاؤں کی اس سے زیادہ خُوش قسمتی کیا ہو گی کہ ایک دیوی آپ جیسے حسین اور بہادُر دیو کی بیوی بنے ۔"

یہ کہہ کر اس نے پَر تولے اور تیزی سے اُڑتا ہوا دیوتاؤں کے محل میں آیا۔ تھور بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ آگے بڑھا اور بے صبری سے بولا "سُناؤ، کیا خبر لائے ؟"

لوکی نے تھور کو تھرم کی شرط سُنائی تو وہ غصّے سے آگ بگُولا ہو گیا اور اس زور سے فرش پر پیر مارا کہ سارا محل لرز اُٹھا۔ دیوتا گھبرا کر اپنے کمروں سے باہر نکل آئے اور تھور کے گِرد جمع ہو گئے۔

"صبر سے کام لیجیے، بڑے بھائی ۔" لوکی نے تھور کو سمجھایا "آپے سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ جہاں طاقت نہ چلے وہاں عقل چلتی ہے۔ میں نے ایسی ترکیب سوچی ہے کہ سانپ مرے، نہ لاٹھی ٹوٹے۔ یعنی آپ کا ہتھوڑا بھی مل جائے اور فریا بھی یہیں دیوتاؤں کے محل میں رہے ۔"

"وہ ترکیب کیا ہے ؟ جلدی بتاؤ ۔" تھور نے پھُنکار کر کہا۔

"ترکیب یہ ہے ..." لوکی کہنے لگا "کہ آپ فریا کا لباس پہن لیں، مُنھ پر نقاب ڈال لیں اور میرے ساتھ تھرم کے پاس چلیں۔ میں آپ کی فریا کی کنیز کے بھیس میں ہوں گا ....."

"کیا — ؟ کیا — ؟" تھرم غصّے سے پیر پٹخ کر بولا "ہم اِتنے بڑے دیوتا اور زنانہ لباس پہنیں ! لعنت ہے ہم پر ....."

"پوری بات تو سُنیے، بڑے بھائی ۔" لوکی ہنسی روک کر بولا "پھر آپ کی مرضی ہے۔ جو چاہیں، کریں۔ جب آپ تھرم کے محل میں پہنچیں تو غم گین صُورت بنا لینا۔ میں تھرم سے کہُوں گا کہ دُلہن کو خوش کرنے کے لیے اُسے کوئی اچھا سا تحفہ دیجیے ......"

"اور میرے ہتھوڑے سے اچھا اور کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا ۔" تھور خوش ہو کر بولا۔ وہ لوکی کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

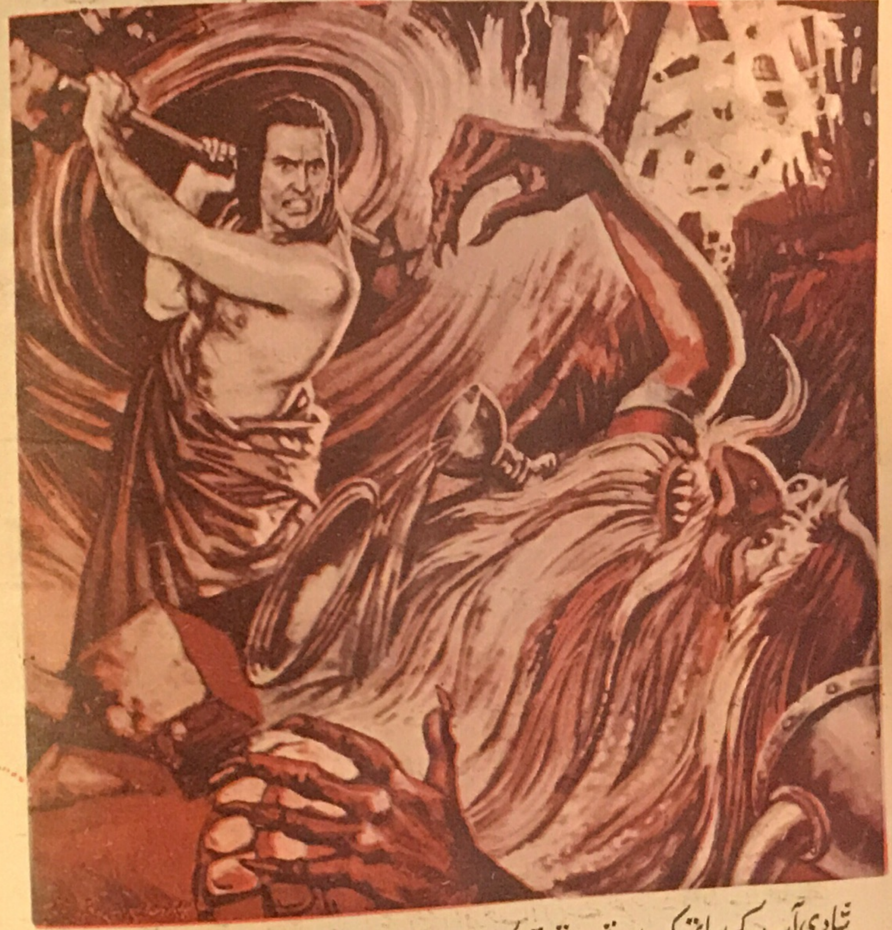
تمام دیوتاؤں نے لوکی کی ذہانت کی تعریف کی اور خوش ہو کر تالیاں بجائیں۔ مگر جب تھور نے فریا کی پوشاک پہنی اور چہرے پر نقاب ڈالی تو دیوتاؤں نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی۔

لوکی نے بھی جھٹ پٹ فریا کی کنیز کا بھیس بدل لیا اور اب یہ دونوں تھرم کے محل میں پہنچے۔ تھرم خوشی سے ناچ اُٹھا اور جب اس نے تھرم سے نقاب اُٹھانے کے لیے کہا تو لوکی بولا "ایسا غضب نہ کیجیے جناب۔ ہمارے ہاں دستُور ہے کہ دُولہا شادی سے پہلے دلہن کا چہرہ نہیں دیکھتا۔ اور پھر دُلہن کو اپنا گھر چھوڑنے کا غم بھی ہے۔ وہ اس بات سے بہت دُکھی ہے جناب، کہ اب اُسے آسمان کے بجائے

زمین پر رہنا پڑے گا۔"

"ہم اس کا یہ دُکھ کس طرح دُور کر سکتے ہیں؟" تھرم نے پُوچھا۔

چالاک لوکی فوراً بولا "آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر دیوتا بہار کی دیوی فریا کی



شادی آپ کے ساتھ کر دیں تو دیوتا تھور کا ہتھوڑا اُسے واپس کر دیا جائے گا۔ میری رائے میں یہ ہتھوڑا آپ فریا کو بطور تحفہ دے دیجیے۔ اس سے وہ خوش ہو جائے گی اور ہمیشہ آپ کی محبّت کا دم بھرے گی۔"

یہ سُن کر تھرم پھڑک اُٹھا۔ بولا "یہ تو تم نے بڑی اچھی بات کہی۔ اس طرح یہ ہتھوڑا ہمارے پاس ہی رہے گا اور اگر دیوتاؤں نے کبھی ہمارے مُنہ لگنے کی کوشش کی تو ہم ان کے محل کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔" یہ کہہ کر تھرم نے دیووں کو حکم دیا کہ تھرم کا ہتھوڑا اُٹھا لاؤ۔

دیووں نے ہتھوڑا لا کر تھرم کے سامنے رکھ دیا۔ تھرم نے ہتھوڑا فریا (تھوم) کو دیتے ہُوئے کہا "ہماری طرف سے یہ حقیر تحفہ قبول کیجیے۔"

تھوم نے چہرے سے نقاب اُتار پھینکی اور تھرم کے ہاتھ سے ہتھوڑا لے کر ایسا وار کیا کہ ظالم دیو کے چھتّیس ٹکڑے ہو گئے۔ پھر اس نے دوسرے دیووں کا بھرتا بنایا اور اس کے بعد تھرم کے محل کو ڈھا کر کھنڈر بنا دیا۔ اس طرح لوکی کی عیّاری سے تھور کو اپنا ہتھوڑا بھی واپس مل گیا اور دیوی فریا بھی ظالم دیو کی بیوی نہ بن سکی۔

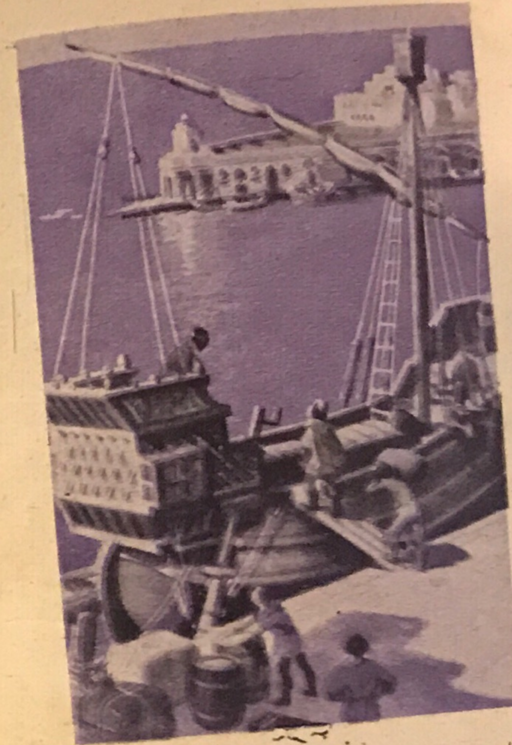
- 1971ء میں سب سے زیادہ کتابیں رُوس میں شائع ہُوئیں۔ اس سال رُوس میں چھپنے والی کتابوں کی تعداد 85,447 تھی۔
- دُوسرے نمبر پر (ریاست ہائے متحدہ) امریکا رہا۔ یہاں 1971 کے دوران 80,559 کتابیں شائع ہُوئیں۔
- تیسرے نمبر پر مغربی جرمنی رہا۔ یہاں اس سال 40,354 کتابیں چھپیں۔
- 1969 میں، دُنیا میں، روزنامہ اخبارات کی تعداد 7660 تھی۔ 1970 میں 8085 ہو گئی۔ 44 مُلکوں میں ابھی تک کوئی روزنامہ اخبار شائع نہیں ہوتا۔
- 1970 تک، دُنیا میں، ریڈیو سیٹوں کی تعداد 720,000,000 تھی اور ٹیلے وژن سیٹ 260,000,000 سے زائد تھے۔

★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★★

دُنیا کا

سب سے بڑا سیّاح





مارکو پولو

آج سے سات سو سال پہلے (اٹلی میں) وینس کا شہر اپنی خوب صُورتی، دولت اور رونق کی وجہ سے تمام دُنیا میں مشہُور تھا۔ یہ ایک بہت بڑی بندرگاہ بھی تھی۔ مگر اس کی بڑائی کا اصلی راز یہ ہے کہ یہاں دُنیا کا سب سے بڑا سیّاح، مارکو پولو، پیدا ہوا۔

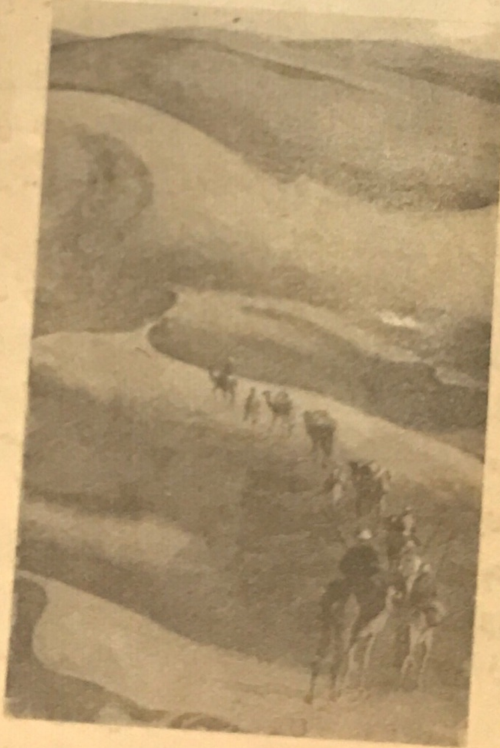
مارکو پولو ایک خوش حال سوداگر، نکولو پولو، کا بیٹا تھا۔ اس کا چچا مافیو بھی سوداگر ہی تھا۔ دونوں بھائی اپنے جہازوں میں فلسطین اور آرمینیا (رُوس) سے ریشم، گرم مسالے، ہاتھی دانت اور دوسری قیمتی چیزیں لاکر یورپ کے ملکوں میں بیچتے تھے۔ فلسطین اور آرمینیا میں یہ چیزیں ایران، ہندوستان اور چین سے آتی تھیں۔

نکولو پولو اور مافیو کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح چین جانے کا راستہ دریافت کر لیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک وہ چین سے تجارتی تعلّقات قائم نہ کریں گے، انھیں تجارت میں کوئی خاص فائدہ نہ ہو گا۔ اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ بحیرۂ اسود کی

بندرگاہ پر پہنچے اور یہاں سے بُخارا (رُوس) گئے۔ بُخارا میں ان دنوں چین کے بادشاہ قبلائی خان کے ایلچی آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے ان دونوں بھائیوں کو چین آنے کی دعوت دی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ انھوں نے یہ دعوت فوراً قبول کر لی اور ایلچیوں کے ہمراہ چین روانہ ہوئے۔

اس سفر میں کوئی ایک سال لگا۔ راستے میں دونوں بھائیوں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں لیکن جب وہ قبلائی خان کے دربار میں پہنچے تو ان کی آنکھیں مارے حیرت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

نکولو پولو اور مافیو دس سال تک قبلائی خان کے دربار میں رہے اور جب واپس روانہ ہونے لگے تو قبلائی خان نے انھیں بیش قیمت تحفوں اور ہیرے جواہرات سے



لاد دیا۔ پھر ان سے تین درخواستیں کیں۔ پہلی یہ کہ وہ کچھ عرصہ اپنے وطن میں رہ کر واپس چین چلے آئیں۔ دوسری یہ کہ وہ (عیسائیوں کے سب سے بڑے پادری) پوپ سے یہ درخواست کریں کہ وہ سو عالم فاضل آدمی چین بھیج دے۔ اور تیسری یہ کہ وہ اس چراغ کا تھوڑا تیل لائیں جو حضرت عیسیٰؑ کی قبر پر روشن ہے۔

دونوں بھائیوں نے وعدہ کیا کہ وہ بادشاہ کی ان تینوں درخواستوں کو پُورا

کردیں گے۔ وہ چین سے وینس واپس آئے اور پوپ سے دو سال تک سو عالم فاضل آدمی لینے کی کوشش کرتے رہے مگر انھیں صرف دو پادری ملے۔ وہ انھی کو لے کر چین روانہ ہو گئے۔ اس مرتبہ ان کے ہمراہ نکولو پولو کا سترہ سالہ لڑکا، مارکو پولو، بھی تھا۔

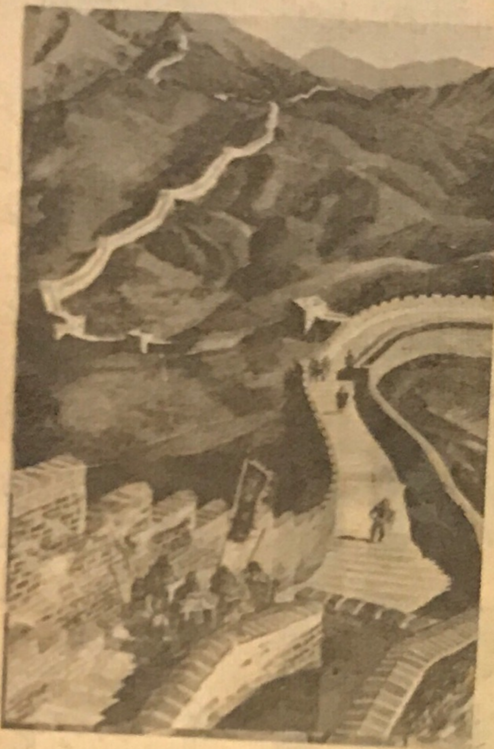
پہلے یہ لوگ یروشلم (بیتُ المقدس) پہنچے اور وہاں سے مقدس تیل حاصل کیا۔ پھر یروشلم سے آرمینیا گئے تو دونوں پادریوں نے چین جانے سے انکار کر دیا۔ ناچار نکولو پولو اپنے بھائی اور بیٹے کے ہمراہ خشکی کے راستے چین روانہ ہو گیا۔ یہ راستہ بہت لمبا اور خطرناک تھا۔ وہ ایسے ایسے مُلکوں سے گزرے جہاں اس سے پہلے یورپ کے کسی باشندے کا گزر نہ ہوا تھا۔ انھیں لق و دق صحرا عبور کرنا پڑے۔ خوفناک پہاڑی دروں سے گزرنا پڑا۔ ہر دم یہ خوف رہتا کہ کہیں ڈاکو حملہ نہ کر دیں۔

آرمینیا سے یہ لوگ تبت پہنچے اور پھر یہاں سے یارقند گئے۔ ابھی انھیں چین پہنچنے کے لیے چالیس دن کا سفر اور کرنا تھا، مگر خدا کی شان، کسی طرح قبلائی خان کو خبر مل گئی۔ اس نے انھیں لانے کے لیے اپنے آدمی بھیجے جو انھیں حفاظت کے ساتھ چین کے شہر کان چاؤ لے گئے۔ مارکو پولو نے اس جگہ دیوارِ چین ضرور دیکھی ہوگی۔

یہ دیوار، جو دُنیا کے عجوبوں میں سے ہے، کچھ اُوپر دو ہزار سال پہلے اِس لیے بنائی گئی تھی کہ دُشمن کی فوجوں کو چین میں گھُسنے سے روکا جائے۔ یہ دیوار ۲۰ فٹ اُونچی اور ۱۴۰۰ میل لمبی تھی۔ اس کی چوڑائی اتنی تھی کہ اس کے اوپر دو گاڑیاں ساتھ چلائی جاسکتی تھیں۔ عجیب بات ہے کہ مارکو پولو نے اپنے سفرنامے میں اور بہت سی جگہوں کا ذکر کیا مگر اس دیوار کا ذکر نہ کیا۔

کان چاؤ سے یہ لوگ چین کے دارُالسلطنت پیکن گئے۔ چین کے بادشاہ قبلائی خان کی نظر مارکو پولو پر پڑی تو اس نے پُوچھا "یہ کون ہے؟" نکولو پولو نے جواب دیا "حضور، یہ میرا بیٹا اور آپ کا غلام ہے۔" جب قبلائی خان کو یہ پتا چلا کہ پوپ نے اُسے کوئی عالم فاضل آدمی نہیں بھیجا تو اُسے بہت افسوس ہُوا، لیکن مُقدس تیل پا کر وہ خوش ہو گیا۔

قبلائی خان مارکو پولو پر بہت مہربان تھا۔ اس نے مارکو پولو کو سفیر بنا کر ہندوستان اور کوچین چائنا تک بھیجا۔



مارکو پولو اور اس کے باپ اور چچا کو چین میں رہتے ہُوئے سترہ سال ہو گئے تھے اور اب وہ بہت دولت مند اور خُوش حال تھے، لیکن انھیں وطن کی یاد بُری طرح ستاتی تھی۔ انھوں نے قبلائی خان سے واپس جانے کی اجازت مانگی تو اس نے انکار کر دیا لیکن قدرت نے ان کے لیے وطن جانے کا ایک بہت اچھا موقع پیدا کر دیا۔ ایران کے بادشاہ نے اپنے سفیروں کو قبلائی خان کے دربار میں بھیج کر ایک چینی شہزادی کا رشتہ مانگا۔ قبلائی خان نے یہ رشتہ منظور کر لیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ شہزادی کو ایران تک پہنچایا کیسے جائے؟ آخر بہت سوچ بچار کے بعد اس کام کے لیے مارکو پولو، اس کے باپ اور چچا کو چُنا گیا۔

یہ تینوں، شہزادی اور ایرانی سفیروں کے ہمراہ سمندر کے راستے ایران کی طرف روانہ ہوئے تو بحرِ ہند میں ایک خوفناک طوفان نے انھیں آ گھیرا۔ شہزادی کا سارا قیمتی سامان ضائع ہو گیا اور ایرانی سفیر ڈُوب گئے۔ لیکن مارکو پولو، اس کا باپ، چچا اور شہزادی بچ گئے اور بڑی مشکل سے ایران پہنچے۔ اس وقت تک ایران کا

بادشاہ مر چکا تھا۔ اس لیے شہزادی کی شادی بادشاہ کے بڑے لڑکے سے کر دی گئی۔



جب مارکوپولو، نکولو پولو اور مافیو وینس واپس پہنچے تو انھیں کسی نے نہ پہچانا۔ ان کے رشتے دار بھی انھیں بھول چکے تھے۔ کچھ عرصے بعد وینس پر ایک پڑوسی ریاست نے حملہ کر دیا۔ مارکوپولو بھی اس لڑائی میں شریک ہوا اور دشمنوں نے اُسے گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ یہاں اس کی ایک اور قیدی سے دوستی ہو گئی۔ جس کا نام "رس تیک یانو" تھا۔ اس نے مارکوپولو کی زبانی اس کے سفر کے حیرت انگیز واقعات سُنے تو اس نے انھیں لکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ مارکوپولو اپنے سفر کے واقعات بتاتا جاتا اور رس تیک یانو انھیں لکھتا جاتا۔

جب یہ دونوں رہا ہوئے تو مارکوپولو کا یہ سفرنامہ "مارکوپولو کے کارنامے" کے نام سے چھپا اور اس کا یورپ کی تمام زبانوں میں ترجمہ ہُوا۔

اگر آپ مستقل خریدار ہیں تو خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیے۔



دماغ لڑائیے

1 - بتائیے، دنیا کی سخت ترین (سب سے زیادہ سخت) چیز کون سی ہے؟
(نام نہیں لکھا)

2 - ذرا جلدی سے بتائیے، دن کہاں سے شروع ہوتا ہے؟

3 - بتائیے، عُمر بڑھتی ہے یا گھٹتی ہے؟
(رانی شاہین فردوس چوہان واہ کینٹ)

4 - افغانستان کی مشہور بندرگاہ کون سی ہے؟
(فرزانہ معرُوف۔ پشاور)

5 - بڑھتی ہے شان اسی قدر اس کی
جس قدر کام کاج ہوتا ہے
گو نہیں بادشاہ یہ لیکن
سر پہ اس کے بھی تاج ہوتا ہے
(نوید سعید۔ لانڈھی۔ کراچی)

6 - انوکھا جانور ہے ایک چمڑے اور لکڑی کا
بتائیں حال کیا اس کا نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے
شکم خالی ہے لیکن بند رکھتا ہے وہ مُنھ اپنا
مگر کوئی اُسے پیٹے تو وہ چلّانے لگتا ہے

7 - یہ دو ساتھی برابر کے ہیں صورت ایک جیسی ہے
سُنو تم غور سے دلچسپ حال ان کا ادھر آؤ
انھیں پھرنے کی دھن ہے جب کبھی ہم جاتے ہیں باہر
ہمارے پاؤں پڑتے ہیں کہ ہم کو ساتھ لے جاؤ
(نجم الدین نجم۔ سکھر)

8 - وہ کون سا پھل ہے جس کا آخری حرف ہٹا دیں تو اس کا مطلب ہو گا ٹھنڈا۔ دُوسرا حرف کاٹ دیں تو اس کے معنی ہوں گے، ہمیشہ۔

9 - دو مُلّاؤں میں کون سی چیز حرام ہوتی ہے؟
(ثمرہ اشرف۔ سمن آباد۔ لاہور)

۱۰ - جلدی سے جواب دیجیے۔ گراموفون ریکارڈ پر کتنی لائینیں ہوتی ہیں؟

۱۱ - جب ہم سو کر اُٹھتے ہیں تو سب سے پہلے کیا کرتے ہیں؟ (راشد توقیر دارا)

12- ایک ایسی سواری کا نام بتائیے جس کا پہلا حرف ہٹا کر "ج" لگا دی جائے تو مُجرموں کے رہنے کی جگہ بن جاتی ہے۔

(محمّد عارف مُغل - لاہور)

13- وہ کون سا پرندہ ہے جس کے تیسرے حرف کو ہٹا دیں تو ایک ہتھیار بن جاتا ہے؟

14- وہ کون سا مہینا ہے جس کے پہلے دو حرف ہٹا دیں تو ایک بہت بڑی سواری کی چیز بن جاتی ہے؟

(محمّد رضوان خاں - لائل پُور)

15- آسمان اور زمین کے درمیان کیا واقع ہے؟

16- آپ کے پین میں سُرخ روشنائی ہے۔ کیا آپ سُرخ روشنائی سے سبز لکھ سکتے ہیں؟

17- اُونٹ کا مُنھ اگر مشرق کی جانب ہو تو بتائیے اس کی دُم کا رُخ کس طرف ہو گا؟

18- وہ کون سی چیز ہے جس کا نام لیں تو ٹوٹ جاتی ہے؟

19- 80+9 = اُناسی ہوتے ہیں یا ہوتا ہے؟

(رانی شہلا ناز گل - واہ کینٹ)

20- وہ کون سا علاقہ ہے جس کے آخری دو حرف کاٹ دیے جائیں تو ہمارے جسم کا ایک حصّہ بن جاتا ہے؟

(شکیلہ سعید، افضال سعید حیدر، اسلام آباد)

21- وہ کون سا پھل ہے جس کا چوتھا حرف کاٹ دیں تو گلے میں ڈالنے والی ایک چیز کا نام بن جاتا ہے؟

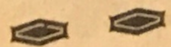
22- وہ کون سی تین حرفی چیز ہے جس کو اُلٹا کر کے پڑھیں تو وہی چیز بن جاتی ہے؟

(وسیم اکرم فارُوقی - گوجرانوالہ)

23- وہ کون سا ملک ہے جس کے پہلے دو حرف ہٹا دیں تو ایک ایسی چیز کا نام بنتا ہے جس کو لوگ کھاتے ہیں۔ اگر اس کے درمیان کے دو حرف ہٹا دیں تو ایک ایسی چیز کا نام بن جائے گا جسے انسان بہت عزیز رکھتا ہے؟

24- وہ کون سا درخت ہے جس میں لکڑی نہیں ہوتی؟

(طاہر جمیل - سیٹلائٹ ٹاؤن - راولپنڈی)



محمّد یُونُس حسرت ایم۔اے

ٹاپُو کی رانی

مُغلوں کے وقتوں میں، ہندوستان کی ایک چھوٹی سی ریاست پر ایک راجپُوت سردار حکومت کرتا تھا۔ مغل بادشاہ ریاست کو فتح کرنے کے لیے ہر جتن کر چکے تھے لیکن سردار ہر بار کوئی نہ کوئی چال چل کر اُن کے ارادوں پر پانی پھیر دیتا تھا۔

سردار کی رانی لمبے قد کی، خوبصُورت راجپُوت شہزادی تھی اور خودداری اور غیرت مندی میں اپنے شوہر سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اس کے ساتھ ہر وقت ایک کالا چیتا رہتا



تھا جو کسی غیر شخص کو اس کے قریب تک نہیں پھٹکنے دیتا تھا۔

سردار کا جب تک بس چلا، وہ مغلوں کا مقابلہ کرتا رہا لیکن جب اس نے دیکھا کہ شکست یقینی ہے تو میدانِ جنگ سے بھاگ کر اپنے محل میں آیا، سارا خزانہ جمع کیا

اور اپنی رانی، ایک خادِم اور خادِم کے بڑے لڑکے کو ساتھ لے کر جنگل کی طرف بھاگ گیا۔

جنگل میں ایک جھیل تھی۔ اس جھیل کے درمیان ایک چھوٹا سا ٹاپُو (جزیرہ) تھا۔ انھوں نے چیتے کو جھیل کے کنارے ہی کھڑا کر دیا اور خود کشتی میں بیٹھ کر ٹاپو میں گئے۔ وہاں تینوں نے مل کر خزانے کو ایک جگہ دبا دیا۔

رانی نے سردار سے کہا "آپ اپنی جان بچانے کے لیے جہاں مناسب سمجھیں چلے جائیں۔ میں اس خزانے کی حفاظت کروں گی اور آپ کی واپسی تک یہیں رہوں گی۔ میرے بارے میں آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میری حفاظت میرا چیتا کرے گا۔"

راجپوت سردار کشتی میں بیٹھ کر جھیل کے کنارے پر آیا اور پھر گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں چلا گیا۔ اس دن کے بعد سے کسی نے نہ تو سردار کو دیکھا اور نہ اس کے متعلق کچھ سُنا۔

رانی ٹاپُو پر ہی رہنے لگی۔ چیتا، خادِم اور اس کا بڑا بیٹا اس کی حفاظت کرتے رہے۔

کچھ مُدّت بعد ایک مُغل شہزادے نے ٹاپُو کی رانی کا ذکر سُنا تو سپاہیوں کا ایک دستہ لے کر اس طرف آیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ٹاپُو تک پہنچتا، رانی نے اپنے سینے میں خنجر بھونک کر اپنا خاتمہ کر لیا۔ خادم اور اس کا بیٹا ٹاپُو سے بھاگ گئے۔ جب شہزادہ اور اس کے سپاہی جھیل کے کنارے آئے تو چیتے نے ان پر حملہ کیا اور ایک ہی وار میں شہزادے کی بوٹی بوٹی کر ڈالی۔ یہ دیکھ کر سپاہی چیتے پر پل پڑے اور انھوں نے اس کو ہلاک کر دیا۔

اس واقعے کے کچھ عرصے بعد رانی کے خادم اور اس کے بیٹے نے واپس آ کر ٹاپُو میں سے خزانہ نکالنا چاہا۔ لیکن جب وہ جھیل کے کنارے پہنچے تو ایک کالے چیتے نے حملہ کر کے خادِم کو ہلاک اور اس کے بیٹے کو شدید زخمی کر دیا۔ خادم کے مر جانے کے بعد اس کے بیٹے نے خزانے کے بارے میں ایک لفظ بھی اپنی زبان سے نکالنے کی جرأت نہ کی۔

اب اس خزانے کے چار مُحافظ تھے۔ (۱) وہ بُوڑھا شکاری جو راجپوت سردار کے

خادم کی اولاد میں سے تھا۔ (2) کالے چیتے کی رُوح (3) رانی کی رُوح اور (4) راجپوت سردار کی رُوح جو ایک بڑا سا سفید اُلّو بن کر ٹاپُو کے ایک درخت کی ٹہنیوں پر ڈیرا ڈالے ہُوئے تھی۔ دیکھنے والوں نے انھیں اکثر دیکھا تھا۔ لیکن اکٹھے نہیں۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ جس وقت کسی شخص نے ان کو اکٹھے دیکھ لیا تو ٹاپُو اور خزانہ سب بہہ جائیں گے۔

یہ داستان مجھے ایک شخص نے سنائی تو میں نے اس بوڑھے شکاری کا کھوج لگانے کی کوشش کی جو راجپوت سردار کے خادم کی اولاد میں سے تھا۔ اس کا پتا چلانے کے لیے مجھے خاصی دوڑ دھوپ کرنی پڑی۔ جب اس سے مل کر میں نے ٹاپُو کے پُراسرار حالات دریافت کیے تو اس نے مجھے وہی داستان سُنائی جو میں اُوپر بیان کر آیا ہوں۔ میری نیّت تو خزانہ تلاش کرنے کی تھی لیکن میں اپنے دل کی بات بوڑھے شکاری کو بتا دیتا تو وہ میرے ساتھ جانے پر کبھی رضامند نہ ہوتا۔ اس لیے میں نے اس سے صرف یہی کہا کہ میں ذرا جھیل کے کنارے شکار کھیلنا چاہتا ہوں۔ تم اس علاقے سے اچھی طرح واقف ہو، میرے ساتھ چلو تو اچھی بات ہے۔



اس پر بھی وہ بڑی مشکل سے میرے ساتھ جانے پر آمادہ ہوا۔ اس نے جھیل کے قریب بیری کے ایک درخت پر مچان بنایا اور ہم دونوں سُورج غروب ہونے سے ذرا پہلے وہاں مچان پر بیٹھ رہے۔ بوڑھا شکاری بار بار کہتا تھا "جناب، یہ آپ نے صحیح نہیں کیا۔ سردار، رانی

یا چیتے میں سے کوئی نہ کوئی ضرور یہاں آئے گا۔ پھر نہ جانے کیا ہو۔"

رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی۔ چاند کی چاندنی میں جھیل چاندی کے ایک بہت بڑے تھال کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ میں کتنی ہی دیر تک اس حسین منظر کی دل کشی میں کھویا رہا۔ ابھی تک جھیل کے کنارے کوئی جانور نہیں آیا تھا۔ بوڑھے شکاری نے میرا شانہ ہلاتے ہوئے کہا:

"جناب، آج رات یہاں کوئی جانور نہیں آئے گا، کیوں کہ وہ چیتا یہاں پھر رہا ہے۔ آئیے، گھر چلیں۔"

لیکن میں نے اس کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ میں یہاں شکار کی نیّت سے آیا ہی کب تھا۔ مجھے خزانے کی تلاش تھی۔

آدھی رات ہوئی تو شکاری کی بھاری آواز نے مجھے چونکا دیا:

"دیکھیے جناب، وہ دیکھیے۔ وہ آگیا ہے!"

دُور جھیل کے کنارے، ریت پر ایک سایہ حرکت کر رہا تھا۔ جب وہ سایہ قریب آیا تو میری رگوں میں خون جمنے لگا۔ سائے نے کالے چیتے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہا تھا اور اس کی نظریں ہماری طرف لگی ہوئی تھیں۔ جب وہ ٹاپو اور ہمارے مچان والے درخت کے درمیان آیا تو ٹاپو کی طرف مُنھ کر کے اُکڑوں بیٹھ گیا۔ اس وقت مچان سے اس کا فاصلہ پچاس قدم تھا۔ میں نے فائر کرنے کے لیے بندوق اُٹھائی لیکن بُوڑھا شکاری چیخ اُٹھا:

"نہیں جناب، نہیں۔" اور اس نے ہاتھ مار کر بندوق ایک طرف کر دی۔

چاروں طرف ایسی خاموشی تھی کہ شکاری کی چیخ کو چیتے نے ضرور سُن لیا ہوگا لیکن اس نے ہماری طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ اسی طرح بیٹھا رہا۔

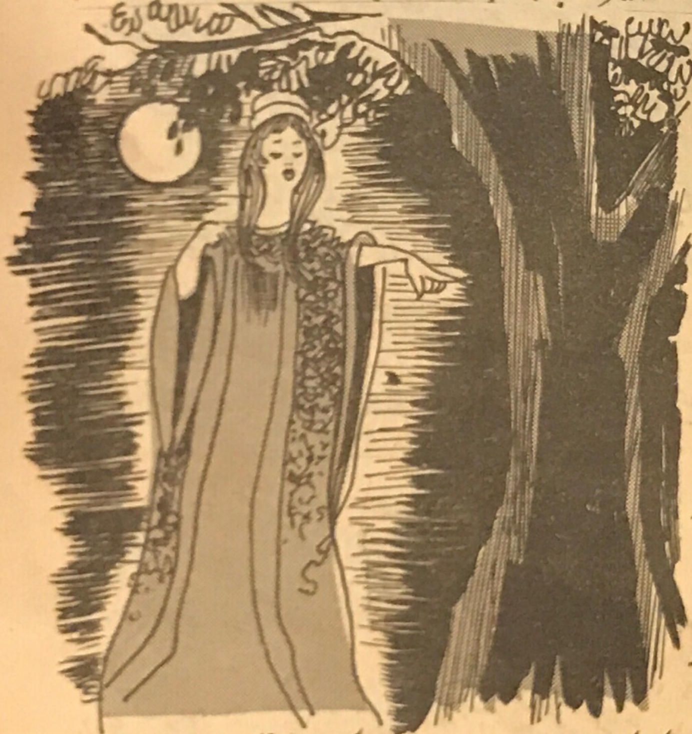
وقت اسی طرح گزرتا گیا اور پھر رات کی خاموشی کو ایک اُلّو کی ہُو ہُو نے توڑنا شروع کیا۔ اُلّو کی یہ آواز ٹاپو کی طرف سے آ رہی تھی اور رات کے سنّاٹے میں بڑی خوفناک معلوم ہوتی تھی۔ پھر جب ٹاپو والے برگد کے درخت پر سے — ایک بڑا سا سفید اُلّو اُڑتا ہُوا آیا تو میرا رُواں رُواں خوف سے کانپ اُٹھا۔ اُلّو بڑے اِطمینان سے چیتے

کی طرف آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک چیتے کے اِردگرد منڈلاتا رہا اور پھر واپس ٹاپو میں چلا گیا۔

"جناب!" بُوڑھا شکاری بول اُٹھا۔ خوف سے اس کے دانت بج رہے تھے۔

"اللہ ہمیں اپنی پناہ میں رکھے۔ وہ اب رانی کو لینے گیا ہے۔"

اس وقت بے ساختہ میرا جی چاہا کہ مچان سے نیچے اُتروں اور تیزی سے اس جگہ سے بھاگ جاؤں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میرا جسم مچان سے چمٹ کر رہ گیا ہے۔



ٹاپو میں پہنچ کر اُلّو برگد کے درخت کے گرد چکّر لگاتا اور خوف ناک آواز میں ہُو ہُو کرتا رہا۔ پھر برگد کے تاریک سایوں میں سے ایک عورت نکلی۔ اُونچی لمبی اور خوبصورت۔ چاندنی رات میں اس کا لباس جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ یہ راجپوت سردار کی رانی تھی۔ وہ بڑے اِطمینان سے جھیل کے پانی پر چلتی ہوئی چیتے کی طرف آئی۔ اُلّو اس کے اُوپر پرواز کر رہا تھا — اور میں پسینے میں نہا رہا تھا۔

وہ چیتے کے پاس آئی اور چیتے نے اُٹھ کر جیسے اُسے سلام کیا۔ پھر اس کے بدن سے اپنا بدن رگڑنے لگا۔ رانی ذرا جھک کر مچان کی طرف دیکھنے لگی۔ اُلّو اس کے کندھے

پر بیٹھ گیا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی رُوح ہو، لیکن اس کی آنکھیں جیتی جاگتی عورت کی طرح چمک رہی تھیں۔

کچھ دیر تک وہ میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر پیٹھ موڑ کر اس طرف دیکھنے لگی جدھر کبھی اس کا شوہر گھوڑے پر بیٹھ کر گیا تھا اور پھر واپس نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد اس نے جھک کر چیتے کے بدن پر ہاتھ پھیرا۔ اُلّو اس کے شانے پر سے اُڑ گیا اور وہ اور اُلّو دونوں ــــ اسی طرح جھیل پار کر کے ٹاپُو پر چلے گئے جس طرح آئے تھے۔

جب وہ دونوں ٹاپُو کے تاریک سایوں میں گُم ہو گئے تو چیتا بھی اپنی جگہ سے اُٹھا اور جھیل کے کنارے کنارے آہستہ آہستہ چلتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

طِلسم ختم ہو چکا تھا۔ میں پسینے میں شرابور تھا اور بوڑھا شکاری بے ہوش۔ دن کے وقت میں نے اس جگہ کا بڑے غور سے معاینہ کیا جہاں چیتا اور رانی آئے تھے، لیکن مجھے کسی کے قدموں کے نشان نہیں ملے۔ نہ رانی کے، نہ چیتے کے۔

اس کے چند روز بعد بڑے زور کی بارش ہوئی اور تمام علاقے میں سیلاب آ گیا۔ جھیل اپنے کناروں سے باہر بہہ نکلی اور اس کے سیلاب میں ٹاپُو بھی بہہ گیا اور برگد کا درخت بھی ــــ اور اس کے ساتھ ٹاپُو میں گڑا ہُوا خزانہ بھی۔

جوابات دماغ لڑاؤ

(1) ہیرا (2) "د" سے (3) گھٹتی ہے (4) افغانستان کی کوئی بندرگاہ نہیں (5) تاجر (6) ڈھول (7) جُوتے (8) سردا (9) مُرغی (10) صرف ایک (11) آنکھیں کھولتے ہیں (12) ریل (13) تیتر (14) اپریل (15) لفظ "اور" واقع ہے (16) پین سے لفظ "سبز" لکھ دیجیے (17) زمین کی طرف (18) خاموشی (19) 80 اور 9 اُناسی نہیں، نواسی ہوتے ہیں۔ (20) سرحد (21) مالٹا (مالا) جان) (22) بلب (23) جاپان (پان۔ (24) کیلے کا۔



ٹھگوں کا ٹھگ

آمر کاظمی

اختر کو زمیندار کے ہاں کام کرتے دو مہینے گُزر چکے تھے۔ اس نے اپنی محنت اور ایمان داری سے زمیندار کا دِل موہ لیا تھا۔ اب عید آ رہی تھی، اس لیے اختر نے گھر جانے کی اجازت چاہی اور ساتھ ہی دو مہینوں کی تنخواہ بھی مانگی۔ زمیندار نے اُسے بخوشی چھُٹی دے دی اور کہنے لگا:

"میں تمھارے کام سے بہت خوش ہُوں۔ تم نے جی لگا کر کام کیا ہے۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میرے پاس نقد روپیہ نہیں۔ یہ گھوڑا لے جاؤ۔ کسی کے ہاتھ بیچ کر بال بچّوں کے لیے کچھ لے جانا۔"

اختر نے گھوڑا لیا اور زمیندار کا شکریہ ادا کر کے اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ قریب ہی ایک گاؤں میں رہتا تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ وہ ایک گھنے جنگل میں سے گزر رہا تھا کہ دو آدمی ملے۔ یہ اس علاقے کے مشہور ٹھگ تھے۔ ایک کا نام پیرُو تھا اور دوسرے کا مُنیرُو۔ انھوں نے اختر سے پُوچھا "کیوں بھئی، گھوڑا بکاؤ ہے؟"

اختر نے سوچا کہ گھوڑے کو منڈی لے جاؤں گا تو دیر لگے گی۔ خُدا نے یہیں

گاہک بھیج دیا ہے۔ کیوں نہ بیچ کر دام کھرے کر لوں۔ یہ سوچ کر اس نے کہا:

"جی ہاں، بکاؤ ہے۔ کیا دو گے؟"

پیرو بولا "یہاں سے کچھ دور ایک بزرگ رہتے ہیں۔ وہ جو قیمت بتائیں گے، ہم دے دیں گے۔"

اختر ان کے ساتھ ہو لیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک مکان آیا۔ تینوں مکان کے اندر داخل ہو گئے۔ سامنے کمرے میں ایک بڑے میاں بیٹھے تھے۔ انھوں نے ان تینوں کو آتے دیکھا تو جلدی جلدی تسبیح پھیرنا شروع کر دی۔

پیرو نے بڑے میاں سے کہا "باباجی، یہ شخص اپنا گھوڑا بیچنا چاہتا ہے۔ آپ کے خیال میں یہ کتنے کا ہوگا؟"

یہ بڑے میاں اِن ٹھگوں کے باپ تھے۔ وہ داڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے "پانچ پیسے دے دو۔" پیرو اور منیرو نے اختر کے ہاتھ پر پانچ پیسے رکھے اور گھوڑا لے کر چلتے بنے۔

اختر نے گھر پہنچ کر بیوی کو سارا قصّہ سنایا اور بولا "میں نے ان ٹھگوں کو مات دینے کی ایک بہت اچھّی ترکیب سوچی ہے۔ تم مجھے اپنا وہ جوڑا دے دو جو تم نے شادی کے دن پہنا تھا۔"

اختر بیوی کے کپڑے پہن کر اُسی جنگل میں پہنچا جہاں اسے پیرو اور منیرو ملے تھے۔ اس نے لمبا سا گھونگھٹ کاڑھ لیا اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ٹھگ اُدھر سے گزرے تو ایک عورت کو تنِ تنہا جنگل میں بیٹھا دیکھ کر رُک گئے۔

پیرو عورت (اختر) کے پاس آیا اور کہنے لگا "اے نیک بخت، کیا بات ہے؟ اس جنگل میں کیسے آگئی اور رو کیوں رہی ہے؟"

یہ سُن کر اختر اور زور زور سے رونے لگا اور جب ٹھگوں نے بہت اصرار کیا تو زنانہ آواز بنا کر کہنے لگا "میں اپنے خاوند کے ساتھ سُسرال جا رہی تھی کہ وہ مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو گیا اور اس بھیانک جنگل میں چھوڑ کر چلا گیا۔ اب میں کیا کروں

اور کہاں جاؤں؟"

منیرو بولا "چل، ہم تجھے اپنے گھر لے چلتے ہیں۔ تُو ہم میں سے کسی کے ساتھ شادی کر لینا۔" اختر تو پہلے ہی تیّار بیٹھا تھا، فوراً ان کے ساتھ چلنے کو تیّار ہو گیا۔

گھر پہنچ کر پیرو اور منیرو نے اپنے باپ کو سارا ماجرا سنایا اور پھر دونوں آپس میں لڑنے لگے۔ پیرو کہتا تھا کہ اس عورت سے میں شادی کروں گا اور منیرو کہتا، میں کروں گا۔ جب نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی تو باپ کہنے لگا:

"کیوں خواہ مخواہ لڑتے ہو۔ چلو، میں اس سے شادی کیے لیتا ہوں۔" اس تجویز پر دونوں بیٹے راضی ہو گئے اور انھوں نے شادی کی تاریخ مقرّر کر دی۔



شادی کے دن پیرو قاضی کو بُلانے گیا تو اختر نے منیرو سے کہا کہ ہمارے ہاں رواج ہے کہ نکاح کے موقع پر چھوارے ضرور ہوتے ہیں۔ اس لیے تم بازار سے چھوارے لے آؤ۔ منیرو چھوارے لینے بازار چلا گیا تو اختر نے ڈنڈا سنبھالا اور پہلے تو بڈھے کی خوب مرمّت کی، پھر اُسے کنوئیں میں لٹکا کر ٹھگوں کا سارا مال سمیٹا اور گھر کی راہ لی۔

پیرو اور منیرو گھر واپس آئے تو دیکھا باپ اور عورت دونوں غائب ہیں۔ وہ سمجھے شاید بوڑھا عورت کو لے کر کہیں چلا گیا ہے۔ انھوں نے قاضی سے معافی مانگی۔ قاضی کہنے لگا "بھاڑ میں جائے تمھارا نکاح۔ مجھے ذرا سا پانی تو پلا دو۔" پیرو نے کنوئیں میں سے پانی کا ڈول نکالا تو دیکھا کہ ڈول سے بوڑھا بندھا ہوا ہے۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھے کو ہوش آیا تو اس نے سارا واقعہ سنایا۔ پیرو اور منیرو غصے سے آگ بگولا ہو گئے اور اختر سے بدلہ لینے کی سوچنے لگے۔

اختر نے گھر جا کر ٹھگوں کا مال بیوی کے حوالے کیا اور بولا "میں اب ایک اور چال چلوں گا اور جو مال ان خبیثوں کے گھر رہ گیا ہے، وہ بھی اٹھا لاؤں گا۔"

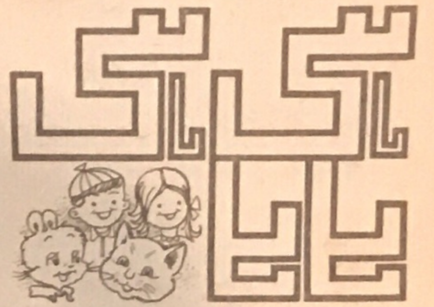
دوسرے دن اختر نے ایک حکیم کا بھیس بدلا اور جنگل میں جا کر اس طرح بیٹھ گیا جیسے کوئی تھکا ماندہ مسافر سستا رہا ہو۔ جب پیرو اور منیرو نے اسے دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور پاس آ کر کہنے لگے "حکیم جی، ہمارا باپ سخت بیمار ہے اگر آپ اسے ٹھیک کر دیں تو ہم آپ کو منھ مانگا انعام دیں گے۔"

دونوں ٹھگ اختر کو اپنے گھر لے گئے۔ اس نے بوڑھے کے زخم دیکھے اور بولا "یہ تو بہت معمولی زخم ہیں۔ میرے پاس ایسے نسخے ہیں کہ بوڑھے کو جوان بنا سکتا ہوں۔" بوڑھا ہاتھ جوڑ کر بولا "حکیم جی، خدا کے لیے مجھے وہ دوائی دے دیجیے۔ میں آپ کو مالا مال کر دوں گا۔"

اختر نے نسخہ لکھ کر پیرو کو دیا کہ شہر سے دوا لے آؤ۔ وہ اسی وقت شہر چلا گیا اسے گئے تھوڑی ہی دیر ہوئی ہو گی کہ اختر گھبرا کر بولا "اوہو! ایک چیز تو رہ ہی گئی۔ میاں منیرو، دوڑ کر جاؤ اور یہ دوا بھی لے آؤ۔"

جب منیرو بھی شہر چلا گیا تو اختر نے بڈھے کو خوب دھنا اور سارا مال اسباب بیل گاڑی میں لاد کر اپنے گھر لے آیا۔ یہ مال ہزاروں روپے کا تھا۔ اس نے گھوڑے کی رقم تو اپنے پاس رکھ لی اور باقی روپیہ خیراتی کاموں پر صرف کر دیا۔





کسی آدمی نے اپنے ایک پیٹو دوست کی دعوت کی۔ سارا کھانا وہی کھا گیا اور گھر والے بھوکے رہ گئے۔ میزبان کا چھ سالہ بچّہ مارے بھوک کے رو پڑا۔ اس پر اس کی ماں نے کہا "مہمان کو جا لینے دو۔ بیٹا! ۔ سارے مل کر روئیں گے۔ اکیلے کیوں روتے ہو؟"

(رانی شاہین فردوس، واہ کینٹ)

ایک دن مُلّا نصرالدّین بازار سے کلیجی لے کر گھر جا رہے تھے۔ ان کے ایک ہاتھ میں کلیجی تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا جس میں کلیجی پکانے کی ترکیب لکھی ہوئی تھی۔ اچانک اُوپر سے ایک چیل نے جھپٹّا مارا اور مُلّا کے ہاتھ سے کلیجی لے کر اُڑ گئی۔

مُلّا ہنس کر بولے "بے وقوف، اِسے پکائے گی کیسے؟ ترکیب تو میرے پاس ہے۔"

(لطیف احمد قُریشی۔ دائرہ دین پناہ)

ایک افیمی (دُوسرے افیمی سے): تم کب پیدا ہوئے تھے؟

دُوسرا افیمی: ۱۹۷۰ء میں۔

پہلا: اور مرے کب تھے؟

دوسرا: ۱۸۵۰ء میں۔

پہلا: پھر تو تم نے بڑی لمبی عُمر پائی۔

(اسحاق محمّد خان۔ کوہاٹ)

حفیظ: آج ماسٹر صاحب نے مجھے ویری گُڈ دیا۔

ندیم: اور تم سارا ہی کھا گئے۔ مجھے کچھ نہ دیا۔ (احمد ریاض۔ سرگودھا)

ایک آدمی (وکیل سے): دیکھیے وکیل صاحب یہ روپیہ کھوٹا تو نہیں؟

وکیل: ایک رُوپیہ اور دیجیے۔

آدمی: (حیرت سے) کیوں؟

وکیل: میرے مشورے کی فیس دو روپے ہے۔

(ندیم سعید۔ لاہور)

ایک بے وقوف اور اس کی بیوی رات کو کوٹھے پر سو رہے تھے۔ لیٹے لیٹے بیوی کہنے لگی، "جب ہمارے ہاں لڑکا ہوگا تو اس کے واسطے چارپائی کہاں بچھائیں گے؟"

بیوقوف بولا "تم اپنی چارپائی اُدھر سرکا لو۔ میں تھوڑی سی اُدھر سرکا لیتا ہُوں۔"

بیوی بولی "لڑکے کی دُلہن کے واسطے بھی جگہ بنا لو۔"

لیکن اب جو انھوں نے چارپائیاں تھوڑی اور سرکائیں تو دونوں کوٹھے سے نیچے جا گرے۔ آخر دونوں روتے ہوئے اُٹھے اور کہنے لگے "خدا ایسی دُکھ دینے والی اولاد کسی کو نہ دے۔"

(رانی شہلا ناز گل۔ واہ کینٹ)

ایک آدمی کے ہاں بیٹا ہوا۔ وہ خوشی میں قوّالوں کو لے آیا۔ انھوں نے قوّالی شروع کی "پردے کے پیچھے، کیا ہو رہا ہے۔ پردے کے پیچھے، کیا ہو رہا ہے۔ گھر والا یہ سُنتے سُنتے تنگ آ گیا تو کمرے کا پردہ اُٹھا کر بولا "یہ دیکھ، پردے کے پیچھے تیری امّاں بیٹھی چھالیہ کتر رہی ہے۔"

(رانی شاہدہ ناز گل، واہ کینٹ)

ایک سردار جی سو رہے تھے کہ گھر میں چور گھس آیا۔ اِتفاق سے سردار جی کی آنکھ کُھل گئی۔ چور بھاگ اُٹھا۔ سردار جی بھی اس کے پیچھے بھاگے۔ جب چور نے دیکھا کہ سردار جی نزدیک پہنچتے جا رہے ہیں تو وہ اور تیزی سے دوڑنے لگا۔ سردار جی کو غصّہ آ گیا۔ انھیں اپنی یہ توہین برداشت نہ ہُوئی کہ چور اُن سے دوڑ میں آگے نکل جائے۔ وہ اتنے تیز دوڑے کہ چور سے ایک میل آگے نکل گئے۔

(رانا تبریز عالم۔ منڈی فیض آباد)

پہلا آدمی (دوسرے آدمی سے): میرا نام اخبار میں آیا ہے۔

دوسرا آدمی: کیا لکھا ہے؟

پہلا آدمی: لکھا ہے کہ پاکستان کی آبادی چھ کروڑ ہو گئی ہے اور ظاہر ہے کہ اس چھ کروڑ میں ایک میں بھی ہُوں۔

(ظفرالاسلام صدّیقی۔ سرگودھا)



ہائے اللہ چڑیل

یہ گرمیوں کی ایک گرم رات کا ذکر ہے۔ میں اپنی باجی شاہدہ ناز کے ساتھ صحن میں چارپائی پر لیٹی سونے کی کوشش کر رہی تھی، مگر گرمی کی شدت اور مچھروں کی یلغار کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کروٹیں لیتے لیتے آدھی رات بیت گئی لیکن نیند کا دُور دُور تک نام و نشان نہ تھا۔ جونہی نیند کا ذرا سا جھونکا آتا، بھن بھن اور پیں پیں کی منحوس آوازیں کانوں سے ٹکراتیں اور کوئی خوں خوار مچھر گردن یا چہرے پر اپنا ڈنک چبھو دیتا۔

ایک دفعہ تو مچھروں کی پوری پلٹن ساز بجاتی حملہ آور ہوئی۔ یہ سب سے شدید حملہ تھا۔ میں گھونسے لہرا لہرا کر اپنا بچاؤ کر رہی تھی لیکن ایک کم بخت مچھر نے گردن پر کاٹ ہی کھایا۔ میں نے غصّے میں آ کر پورے زور سے گھونسا جو چلایا تو وہ سیدھا باجی شاہدہ ناز کی ناک پر جا لگا۔ وہ بے چاری اس آفتِ ناگہانی سے گھبرا کر اُٹھ بیٹھیں اور ناک پکڑ کے چیخنے لگیں۔ تمام گھر والے بھی اُٹھ بیٹھے میں نے اپنی صفائی پیش کی اور باجی کو بڑی مشکل سے منایا۔

تھوڑی دیر بعد باجی تو گہری نیند کے مزے لے رہی تھیں اور میں نیند رانی کو کوس رہی تھی جو مجھ سے خفا ہو کر کوسوں دُور بھاگ گئی تھی۔ رات کا تقریباً ایک بج چکا تھا اور میں ابھی تک دشمنوں سے دو دو ہاتھ کر رہی تھی۔ نامعقول میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے۔ جیسے میرے خون میں شہد ملا ہو۔

اب ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے آنے لگے تھے جس سے جان میں جان آئی۔ پھر اچانک ہوا تیز ہو گئی۔ درخت لرزنے لگے۔ مٹّی اور سُوکھے پتّے اُڑ اُڑ کر اُوپر گرنے لگے۔ باجی نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور غڑاپ سے چادر میں چہرہ چُھپا لیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر ان کے خرّاٹے سُنائی دینے لگے۔ ہمارے لان میں آم کا ایک درخت بھی تھا۔ جب ہوا اس کے پتّوں سے ٹکراتی ہوئی گزرتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی چُڑیل بال کھولے، کھڑی سِسکیاں بھر رہی ہے۔ میں نے خوف سے چادر اوڑھ لی۔ اسی وقت کوئی کالی کالی سی چیز چادر میں گُھس آئی۔ میں نے چیخ ماری اور جلدی سے باجی کے اُوپر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ گُھپ اندھیرا، چنگھاڑتی ہوئی ہوا اور میرے لہراتے ہُوئے کالے بال۔ باجی نے ایک بھیانک چیخ ماری اور چیخنے لگیں "ہائے اللہ چڑیل! ہائے اللہ چُڑیل!"

باجی کی دِل ہلا دینے والی چیخ سن کر میں اور ڈر گئی اور بے تحاشا چیخنے لگی۔ ہماری چیخوں سے نہ صرف گھر والے اُٹھ بیٹھے بلکہ آس پاس کے گھروں کے لوگ بھی آوازیں دے دے کر پوچھنے لگے کہ کیا بات ہے؟ ابّو نے ٹارچ کی روشنی ڈالی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک کوّا، جو درخت سے گر کر میرے بستر پہ آ گیا تھا، سہما سہما میرے سرہانے بیٹھا ہے اور میں باجی پر سوار چیخ رہی ہُوں۔ پہلے تو سب ہنس پڑے۔ پھر مجھے خوب کوسا گیا اور ڈرپوک اور بُزدل کے خطاب سے نوازا گیا۔ خیر، مجھے تو بُزدِل کا خطاب مل گیا لیکن ساتھ ہی باجی کی بہادری کا بھی بھانڈا پھُوٹ گیا، جو بڑی بہادر بنتی تھیں۔

(رانی شہلا ناز گل۔ واہ کینٹ)

ہم نے روزہ رکھا

یہ پہلی سحری کا واقعہ ہے۔ ہم نے سونے سے پہلے بھابی سے کہا کہ وہ ہمیں سحری کے وقت ضرور جگائیں۔ ہمیں سحری کو اُٹھنے کا بہت شوق تھا۔ مگر گھر والے بچّہ سمجھ کر نہیں جگاتے تھے۔ اس لیے ہم نے بھابی کو خوب تاکید کر دی۔ اور ساتھ ہی دھمکی بھی دی کہ اگر انھوں نے نہ جگایا تو ہم ان کا بائیکاٹ کر دیں گے۔

ہم مزے سے چادر تانے خوابِ خرگوش کے مزے لُوٹ رہے تھے کہ کسی نے بڑی بے دردی سے ہمارے اُوپر سے چادر اتار کر پرے پھینک دی ہم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے، مگر حالت یہ تھی کہ آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ بار بار اُونگھ جاتے تھے۔ اسی حالت میں پتا نہیں کس طرح غسل خانے میں پہنچے۔ واپس آکر بھابی سے پُوچھا:

"کیا دم ہُوا ہے؟"

"بے وقوف کیا بک رہی ہو؟" بھابی ہنسیں۔

"ہمارا مطلب ہے کیا ٹائم ہُوا ہے؟"

"چار بجنے میں تین منٹ ہیں۔"

"افوہ! ابھی تو بہت وقت ہے۔" یہ کہہ کر ہم فوراً مسہری پر جا کر لیٹ گئے لیکن بھابی کہاں چھوڑنے والی تھیں۔

"اُٹھو، ورنہ پھینکتی ہُوں پانی۔" انھوں نے دھمکی دی۔ مگر ہم ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بھابی غسل خانے سے ٹھنڈے پانی کا جگ بھر لائیں۔ اس وقت تک ہم نیند رانی کی آغوش میں پہنچ گئے تھے۔ پانی جو اوپر پڑا تو چھکے چھوٹ گئے۔ کچھ کچھ اونگھتے اور پنڈلی کھجلاتے بستر سے اُٹھے ہی تھے کہ امّی جان نے ہمارے ہاتھ میں پیالہ تھما دیا کہ بیٹا جاؤ طابلے کی دکان سے دہی لے آؤ۔

ہم نے ایک ہاتھ میں پیالہ پکڑا اور دُوسرے میں پیسے تھامے اور طابلے کی دکان کی طرف چل پڑے۔ نیند نے ابھی تک ہمارا پیچھا نہ چھوڑا تھا۔ دکان پر کافی بھیڑ تھی۔ ہم نے سوچا، ہماری باری تو بہت دیر میں آئے گی، کھڑے کھڑے بور ہو جائیں گے چنانچہ وہیں بنچ پر بیٹھ گئے اور اُونگھنے لگے۔ خُدا جانے کتنی دیر تک سوتے رہتے کہ طابلے نے جھنجھوڑ کر جگا دیا اور بولا:

"آخاہ! یہ تو جمیل بھائی کی لڑکی ہے۔ آ بیٹا، دہی دُوں۔"

ہم دہی لے کر فوراً گھر کی طرف دوڑے۔ گھر والے غصّے سے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ امّی ہمیں دیکھتے ہی چمٹا اُٹھا کر لپکیں:

"کہاں مر گئی تھی؟ دیکھ تو، پانچ بجنے والے ہیں اور ابھی تک کسی نے

لُقمہ بھی منھ میں نہیں رکھا۔ سب دہی کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔"

وہ تو اچھا ہوا کہ بھابی درمیان میں آگئیں ورنہ امّی مار مار کر بھُرکس نکال دیتیں۔

(رضیہ گلشن جمیل سیالکوٹ)

واہ رے زمانے!

جب ہمارے ابّا جان ہم سے بات کرتے ہیں تو کچھ یُوں کہتے ہیں:

"وہ بھی کیا زمانہ تھا جب ہم چھ پیسے گز لٹھا خریدا کرتے تھے، پانچ روپے کا آٹا لانے کے لیے بیل گاڑی کی ضرورت پڑتی تھی، اور ایک روپے سیر خالص گھی ملا کرتا تھا۔"

ابّا جان کی یہ باتیں سن کر ہماری آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں لیکن کوئی بات نہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب ہم کہا کریں گے کہ "واہ صاحب! وہ بھی کیا زمانہ تھا جب ہم ساڑھے سات روپے سیر بناسپتی گھی اور بیس روپے سیر خالص گھی خریدا کرتے تھے۔ سو روپے کا آٹا لانے کے لیے ریڑھے کی ضرورت پڑتی تھی۔" کیوں کہ اس وقت مہنگائی اتنی ہو چکی ہو گی کہ ہم پچاس روپے کا نوٹ دکان دار کو دے کر کہا کریں گے کہ ایک سیر گھی اور ایک بسکٹ کا ڈبا دے دو۔ اس پر دکان دار کہے گا کہ بابوجی، پانچ روپے اور دو۔ یہ پیسے کم ہیں۔

(طاہر جمیل راولپنڈی)

مُرغے کی سواری

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم دوسری کلاس کے طالبِ علم تھے۔ چوں کہ ہم ذرا چھوٹے تھے، اس لیے بڑے لڑکے ہم پر بہت رُعب جمایا کرتے تھے۔ ہمارے سکول میں دستور تھا کہ پاس ہونے والے لڑکوں کو لڈو انعام میں ملا کرتے تھے۔

سالانہ امتحان کے بعد جب ہم رزلٹ سُننے گئے تو لڈّوؤں کا ایک لفافہ

ہمارے ہاتھ میں بھی پکڑا دیا گیا اور ہم خوش خوش گھر کی طرف چل دیے۔ ابھی ہم نے آدھا راستہ بھی طے نہ کیا تھا کہ ہماری کلاس کا ایک لڑکا ہمارے ہاتھ سے لفافہ چھین کر بھاگ گیا جس پر ہمیں بہت غصّہ آیا اور ہم نے تہیّہ کر لیا کہ کل ماسٹر صاحب سے کہہ کر اس لڑکے کو سزا دلوائیں گے۔

دوسرے دن ہم نے ماسٹر صاحب کو جا کر سارا واقعہ سُنایا۔ چھوٹا ہونے کی وجہ سے ماسٹر صاحب ہمیں بہت پیار کرتے تھے۔ انھوں نے اسی وقت اس لڑکے کو بُلایا اور دو چار تھپّڑ مار کر کہا کہ فوراً مُرغا بن جاؤ۔ وہ مُرغا بنا تو انھوں نے ہمیں اس کے اُوپر بٹھا دیا اور اس کو حکم دیا کہ میدان کے پانچ چکّر لگاؤ۔ وہ چکّر لگاتا جا رہا تھا اور ہم آہستہ آہستہ اس سے کہہ رہے تھے "کہو میاں مُرغے، مزا آیا لڈّو چھین کر کھانے کا؟" اس دن کے بعد سے لڑکوں نے ہمیں تنگ کرنا چھوڑ دیا کہ کہیں ان کا بھی یہی حشر نہ ہو۔

(اعجاز افضل۔ راولپنڈی)

چلنا ہے تو پیدل چلیے

بس سٹاپ پر کھڑے کھڑے آدھ گھنٹا گزر گیا تھا لیکن بس آنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی اگر کوئی آتی بھی تو وہ سٹاپ پر کھڑے ہُوئے انسانوں کے ہجُوم سے ڈر کر رُکنے کی جُرأت ہی نہ کرتی۔ سٹاپ پر کھڑے ہُوئے لوگ جب کسی بس کو گزرتے ہوئے دیکھتے تو جھلّا کر اومنی بس سروس اور ڈرائیوروں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیتے۔

آخر خاصی دیر بعد جب ہم لوگ بالکل نا امّید ہو گئے تھے تو ایک ڈبل ڈیکر جھولے سے سٹاپ پر آ رُکی۔ خوش قسمتی سے اس میں تھوڑی سی جگہ بھی تھی۔

بس کا سٹاپ پر رُکنا تھا کہ تمام مسافر اس کی طرف لپکے اور ایک دُوسرے کو کُچلتے ہُوئے سوار ہونے لگے۔

کہتے ہیں کہ پہلا دروازہ اور پہلی پانچ چھ سیٹیں عورتوں کے لیے ہوتی ہیں لیکن ان سیٹوں پر اکثر مرد حضرات قبضہ جما لیتے ہیں۔ خیر، میں بھی جُوں تُوں کر کے سوار ہو گئی۔ سیٹ تو کیا ملتی، ہاں ایک کونے میں کھڑے ہونے کی جگہ ضرور مل گئی۔ اب

بس چلی تو کنڈکٹر صاحب کی آواز سنائی دی۔ جو لوگوں سے کرائے کے پیسے لے لے کر اپنی جیب میں رکھ رہے تھے اور ساتھ ہی لیکچر بھی دے رہے تھے۔

کنڈکٹر کا لیکچر سُنتے سُنتے ہمارے سکول کا سٹاپ آ گیا۔ لڑکیوں نے بہت منّت سماجت کی تو کنڈکٹر نے سیٹی بجائی، مگر ڈرائیور صاحب کے کان پر جُوں تک نہ رینگی۔ وہ بس کو چلاتے ہی چلے گئے۔ آخر مزنگ چُنگی پر پہنچ کر ان کو کچھ ترس آیا اور انھوں نے ایک زوردار بریک لگا کر بس کو روکا۔ شکر ہے خُدا کا جو بس اُلٹی نہیں۔

ہم سب لڑکیاں بہُت مشکل سے بس سے اُتر کر سکول کی طرف بھاگیں۔ جب سکول پہنچیں تو گیٹ بند ہو چکا تھا اور دوسرا پیریڈ گزر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے، چوکیدار کی منّت کر کے ہم اندر داخل ہُوئے۔ یہ ایک دن کی بات نہیں روزانہ کا معمول ہے۔ اب ہم سوچ رہے ہیں کہ سکول پیدل جایا کریں اور بس کی سواری کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیں۔

(ریحانہ یاسمین، اچھرہ لاہور)

میاؤں!

ایک دِن، شام کے وقت، ہم لوگ لان میں گھوم پھر رہے تھے کہ امّی چچی جان سے بولیں "دو تین دِن سے جمعدار نہیں آیا ہے۔ لان میں پھلوں کے چھلکے پڑے ہیں۔ کسی کا پاؤں پھسل گیا تو بُرا ہو گا۔"

ہم بھلا کب چُپ رہنے والے تھے، بولے "میں آپ کو ایک واقعہ سُناؤں۔ ایک شاعر اور اس کا دوست چہل قدمی کر رہے تھے کہ شاعر کے دوست کا پاؤں کیلے کے چھلکے پر سے پھسل گیا اور وہ بے چارہ دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔ اس پہ شاعر نے فوراً یہ شعر کہا:

چلتے چلتے پھسل گیا پاؤں

ابھی میں دوسرا مِصرع کہنے والی تھی کہ خود میرا پاؤں ایک چھلکے پہ سے پھسل گیا اور میں دھم سے زمین پر گر پڑی۔ یہ دیکھ کر میرا کزن فوراً بولا:

وہ گرے دھم سے اور کہا "میاؤں!"

(نیل کنول۔ ماڈل ٹاؤن لاہور)

دُم اور ہم

"یا اللہ! یہ گرمیوں کی دوپہریں تو شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہوتی ہیں۔" ہم نے کلاک پر ایک حسرت ناک نظر ڈال کر سوچا جو ابھی صرف ساڑھے تین ہی بجا رہا تھا۔ اور نویں دفعہ بُک شیلف میں رکھی ہوئی کتابیں گننے میں مشغول ہو گئے۔

ہُوا کچھ یوں تھا کہ کل دوپہر جب ہم سب بہن بھائی کرکٹ کھیلنے میں مصرُوف تھے تو جوش میں آکر ہم نے گیند کو کچھ زیادہ ہی زور سے ہٹ لگا دی۔ یہ اور بات تھی کہ ہمارا ارادہ بالکل بھی امّی جان کے کمرے کی کھڑکی کا شیشہ توڑنے کا نہ تھا۔ مگر یہ امّی جان کو کون سمجھاتا۔ اسی لیے آج سے گھر میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا تھا، جس کے تحت کوئی بچّہ پانچ بجے سے پہلے بستر سے نہیں اُٹھ سکتا تھا۔

کتابوں سے اُکتا کر ہم نے امّی جان کی طرف دیکھا جو ہمارے پاس ہی سوئی ہوئی تھیں۔ اچانک ایک خیال بجلی کی تیزی سے ہمارے دماغ میں آیا کہ کیوں نہ کھسک جائیں۔ اگرچہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانا بے حد مشکل تھا کیوں کہ امّی جان ذرا سی آہٹ پر بھی جاگ جاتی ہیں لیکن ہم نے ہمّت نہ ہاری۔ اللہ کا نام لے کر دونوں ہاتھ بستر پر جمائے اور تھوڑا سا کھسکے۔ پھر امّی جان کی طرف دیکھتے ہوئے دونوں پاؤں چارپائی سے نیچے لٹکائے اور اس کے بعد ایک دم کھڑے ہو گئے لیکن بھوں کی خوف ناک آواز کے ساتھ ٹامی ہماری ٹانگ پکڑتے کو مڑا تو ہمیں احساس ہُوا کہ ہم اس کی دُم پر کھڑے ہیں۔ گھبرا کر چھلانگ جو لگائی تو اس زور سے الماری سے ٹکرائے کہ دِن میں تارے نظر آ گئے۔

ہوش آیا تو سر پر پٹّی بندھی ہُوئی تھی۔ امّی ہمیں آنکھیں کھولتا دیکھ کر نصیحت آمیز لہجے میں بولیں "دیکھا ماں کی بات نہ ماننے کا نتیجہ" اور ہم نے نہایت فرماں برداری سے نظریں جُھکا لیں۔ لیکن ذرا ٹھہریے۔ کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھے کہ امّی جان نے اپنا حکم واپس لے لیا یا ہم نے فرار ہونا چھوڑ دیا۔ جی نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہاں البتّہ زمین پر پاؤں رکھنے سے پہلے ہم ایک دفعہ نیچے ضرور دیکھ لیتے ہیں۔ (ثمرہ اشرف لاہور)

سُنیے



اس ماہ کا تعلیم و تربیت نہایت دل چسپ تھا۔ ہر کہانی بہترین تھی، خاص کر دعوت یا مصیبت اور شہزادہ سگرڈ کی تلوار بہت پسند آئیں۔ ننّھے ادیب میں "تین کا پہاڑا" کہانی بھی خوب تھی۔ آپ رسالے کی قیمت میں 25 پیسے کا اضافہ کر رہے ہیں۔ یہ تو بہت معمولی قیمت ہے۔ اگر آپ قیمت دوگنی بھی کر دیں تو میں تب بھی ضرور خریدوں گا۔

(شاہ زمان احمد رانا۔ واہ کینٹ)

کہانیوں میں شہزادہ سگرڈ کی تلوار اور کامیابی کا راستہ بہت پسند آئیں۔ دماغ لڑاؤ رسالے کی جان ہے۔ مہربانی فرما کر سرورق پر توجّہ دیجیے۔

(ہدایت اللہ غمگین چوک ہاتھیاں)

ستمبر کا رسالہ بے حد پسند آیا۔ ٹائٹل بھی اچھا تھا۔ یا اللہ تیرا شکر ہے، بندر کی دوستی، شہزادہ سگرڈ کی تلوار، کامیابی کا راستہ اور دعوت یا مُصیبت بہت اچھی کہانیاں ہیں۔

(میاں طاہر الدین اسلام آباد)

مضمون "ڈینو سار کیوں ناپید ہو گئے" اور کہانی "ہاتھی میرا ساتھی" بہت پسند آئی۔ آپ نے تعلیم و تربیت کی قیمت میں صرف 25 پیسے کا اضافہ کیا ہے۔ اگر اس کی قیمت دو روپے بھی ہو گئی تو ہم اِسے پڑھنا نہیں چھوڑیں گے۔

(خواجہ ضیاء اللہ جڑانوالہ)

کہانی "دعوت یا مُصیبت" پڑھ کر بڑی ہنسی آئی۔ کامیابی کا راستہ، یا اللہ تیرا شکر ہے، بندر کی دوستی اور تین کا پہاڑا کہانیاں بھی اچھی تھیں۔

(لبنیٰ غفّار۔ کراچی)

تعلیم و تربیت کا ٹائیٹل تو ہر دفعہ خوب سے خوب تر ہوتا ہے۔ ہاتھی میرا ساتھی، ڈینو سار کیوں ناپید ہو گئے، بندر کی دوستی، کامیابی کا راستہ اور دعوت یا مصیبت بہترین کہانیاں تھیں۔ نظمیں بھی اچھی تھیں۔

(محمّد عارِف مُغل۔ لاہور)

اس ماہ کا ٹائیٹل بہت ہی خوبصورت تھا۔ کہانیوں میں یا اللہ تیرا شکر ہے، بندر کی دوستی، کامیابی کا راستہ اور ننھے ادیب میں بڑی ٹافی اور تین کا پہاڑا بہت ہی پسند آئیں۔ نظمیں، دماغ لڑاؤ اور لطائف بھی خوب رہے۔

(افضال سعید، شکیلہ سعید، اسلام آباد)

ستمبر کا رسالہ پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ سرورق بہت خوب صورت تھا۔ مہربانی فرما کر رسالے میں اس ماہ کی عظیم شخصیت کا سلسلہ دوبارہ شروع کریں۔

(اعجاز احمد سکندری کورونہ مردان)

صفدر ادیب صاحب کی کہانی "بندر کی دوستی" بہت پسند آئی۔ اشرف صبوحی صاحب کی دعوت یا مصیبت بھی اچھی کہانی تھی۔

(مشتاق احمد شیخ۔ مظفر آباد)

ٹائیٹل دیکھتے ہی دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ لطیفے بھی بہت اچھے تھے۔

(محمد تسلیم۔ روزینہ۔ محمد آصف لاہور)

اس دفعہ کا ٹائیٹل بہت ہی اچھا تھا۔ بندر کی دوستی، شہزادہ سگرڈ کی تلوار اور ننھے ادیب کی تمام کہانیاں پسند آئیں۔

لطیفے بھی اچھے تھے۔ رفیق احمد خان صاحب کو حاضر جواب مسخرہ لکھنے پر میری طرف سے مبارک باد دیجیے۔

(شاہد رؤف، رخسانہ نجم السحر راولپنڈی)

مولانا کوثر نیازی صاحب کا مضمون بہت اچھا ہوتا ہے۔ کہانیوں میں یا اللہ تیرا شکر ہے، شہزادہ سگرڈ کی تلوار اور کامیابی کا راستہ بہت ہی اچھی تھیں۔ لطیفے بھی اچھے تھے۔

(محمد تنویر احمد گھال۔ جہلم)

ایک روپیہ لے کر گیا تھا۔ بازار جاکر معلوم ہوا کہ رسالے کی قیمت میں 25 پیسے کا اضافہ ہوگیا ہے۔ مجبوراً چونی ادھار کرنا پڑی۔ اب قیمت اور نہ بڑھائیے گا۔ ٹائیٹل بہت خوبصورت تھا۔ کہانیاں بھی لاجواب تھیں۔

(محمد شکیل چودھری جہلم)

ستمبر کا تعلیم و تربیت بہت خوبصورت تھا۔ شہزادہ سگرڈ کی تلوار اور ہاتھی میرا ساتھی بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ آپ نے رسالے کی قیمت بڑھادی ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے ساتھ رسالہ بھی تو اچھا ہوگیا ہے۔

(ندیم پرویز۔ افشاں تبسم۔ لاہور)

ٹائیٹل خوبصورت تھا۔ ہاتھی میرا ساتھی، بندر کی دوستی، شہزادہ سگرڈ کی تلوار اور دعوت یا مصیبت کہانیاں بہت پسند آئیں۔ ننھے ادیب کی کہانی "ہم جو مانیٹر بنے" پسند آئی۔

(عابد رشید۔ اسلام آباد)

ہم تمام گھر والے تعلیم و تربیت شوق سے پڑھتے ہیں۔ کیوں کہ یہ بہت معلوماتی اور دلچسپ ہوتا ہے۔ ویسے تو تمام کہانیاں ہی اچھی تھیں مگر شہزادہ سگرڈ کی تلوار اور دعوت یا مصیبت بہت پسند آئیں۔ ہاتھی میرا ساتھی، کہانی بھی اچھی ہے۔ ننھے ادیب میں بڑی ٹافی اور تین کا پہاڑا اچھی کہانیاں ہیں۔

(جاوید نذیر۔ خانیوال)

مجھے "یا اللہ تیرا شکر ہے" اور دعوت یا مصیبت کہانیاں بہت پسند آئیں۔ ننھے ادیب میں "ہم جو مانیٹر بنے" اچھی کہانی تھی۔

(اسلم رضا۔ اسلام آباد)

ستمبر کا رسالہ ہر لحاظ سے اچھا تھا تمام کہانیاں پسند آئیں۔ خاص کر ہاتھی میرا ساتھی اور دعوت یا مصیبت۔ ننھے ادیب میں "تین کا پہاڑا" اور "باجی صاحبہ" اچھی کہانیاں تھیں۔

(سیف الدین خالد، عذرا، نائیلہ)

سرورق دیکھ کر طبیعت مچلی۔ مجبوراً رسالہ خریدنا پڑا۔ کہانی یا اللہ تیرا شکر، بہت پسند آئی۔ اس کے علاوہ دعوت یا مصیبت اور بندر کی دوستی بھی اچھی کہانیاں ہیں۔ لطیفے بھی چٹ پٹے تھے۔ ننھے ادیب میں "ہم مانیٹر بنے" پڑھ کر ہم خوب ہنسے۔

(احمد شکیل۔ ایبٹ آباد)

السّلامُ علیکم کے بعد عرض ہے کہ میں بخیریت ہوں اور امید ہے کہ آپ بھی بخیریت ہوں گے۔ حال یہ ہے کہ ستمبر کے تعلیم و تربیت کا سرورق بہت پسند آیا۔ کہانیاں سب اچھی تھیں۔ لطیفے بھی بہت اچھے تھے۔

(عبدالقدوس۔ محمد سلیم۔ ٹوپی)

ستمبر کا شمارہ نہایت عمدہ تھا۔ سب کہانیاں پسند آئیں۔ "دماغ لڑاؤ" میں دماغ خوب لڑایا۔ ننھے ادیب میں کسی کی کہانی بھی تعریف کی مستحق نہیں۔

(سکندر ظہور۔ میاں چنوں)

کہانیوں میں ہاتھی میرا ساتھی، یا اللہ تیرا شکر ہے اور دعوت یا مصیبت بہت

ہی دل چسپ تھیں۔ حاضر جواب مسخرہ اتنی اچھی نظم ہے کہ اس کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔

(لطیف، سعید، رشیدہ۔ دائرہ دین پناہ)

ستمبر کا پیارا پیارا تعلیم و تربیت ملا۔ ٹائیٹل دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ ہاتھی میرا ساتھی ایک اچھی کہانی ہے۔ یا اللہ تیرا شکر ہے، بندر کی دوستی، کامیابی کا راستہ اور دعوت یا مصیبت بھی قابلِ تعریف کہانیاں ہیں۔ "دنیا" اور "ننھی مانی" اچھی نظمیں ہیں۔

(فرزانہ معروف، پشاور)

سرورق خاص نہ تھا۔ کہانیوں میں ہاتھی میرا ساتھی، بندر کی دوستی اور کامیابی کا راستہ پسند آئیں۔ حاضر جواب مسخرہ نظم بھی اچھی تھی۔ یا اللہ تیرا شکر ہے، جیسی کہانیاں نہ چھاپا کریں۔ پڑھ پڑھ کر بور ہو چکے ہیں۔ لطائف میں نوید سعید اور ناصر رضی کے لطیفے اچھے تھے۔ ننھے ادیب کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ کیا ہمارے ساتھی معیاری کہانیاں نہیں لکھ سکتے ہے

(نیر اقبال۔ کراچی)

ماہ ستمبر کا چمکتا دمکتا تعلیم و تربیت ملا۔ ٹائیٹل دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ اس مرتبہ تمام مضامین بھی بے حد دلچسپ تھے اور نظمیں بھی بہت خوب تھیں۔ اتنا شاندار اور دل چسپ رسالہ شائع کرنے پر میری جانب سے مبارک باد قبول فرمائیے۔

(شاداب مسرور۔ سعود آباد، کراچی)

بچوں کے رسالوں میں تعلیم و تربیت سب سے اچھا رسالہ ہے۔

(محمد عارف۔ عبدالستار۔ کراچی)

مولانا کوثر نیازی کا مضمون جہاد بہت پسند آیا۔ لطیفے بھی اچھے تھے۔ ننھے ادیب میں ہم جو مانیٹر بنے، باجی صاحبہ اور بڑی ٹانی کہانیاں پسند آئیں۔

(محمد اسماعیل خاں جوہر آباد)

ماہ ستمبر کا شمارہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ پُراسرار خلائی روشنی کی جگہ کوئی اور تصویری کہانی شروع کر دیں۔ ڈینو سار کیوں ناپید ہوگئے؟ اور جان دار کیا کھاتے ہیں، کافی معلوماتی مضمون تھے۔

(زاہد رشید۔ پشاور یونی ورسٹی)

